دسمبر ۱۹۸۹ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

★ تحریک اسلامی کے قائد و امیر کے حقوق و اختیارات
کے موضوع پر مولانا مودودی مرحوم کی ایک اہم تحریر

یکے از مطبوعات
تنظیم اسلامی

تازہ، خالص اور توانائی سے بھرپور

پاک پیئور®

مکھن اور دیسی گھی

یونائیٹڈ ڈیری فارمز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

(قائم شدہ ۱۸۸۰) لاہور

۲۲- لیاقت علی پاک ۴- بیڈن روڈ- لاہور، پاکستان

فون: ۲۲۱۵۹۸ - ۳۱۲۷۵۴

SV ADVERTISING

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اُس میثاق کو یاد رکھو جو اُس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی

جلد: ۳۸
شمارہ: ۱۲
جمادی الاولیٰ ۱۴۱۰ھ
دسمبر ۱۹۸۹ء
فی شمارہ ۵/-
سالانہ زرتعاون ۵۰/-

ماہنامہ میثاق لاہور

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

SUBSCRIPTION RATES OVERSEAS

U S A US $ 12/=
c/o Dr Khursid A. Malik
SSQ 810 73rd street
Downers Grove I L 60516
Tel : 312 969 6755

c/o Mr. Rashid A. Lodhi
SSQ 14461 Maisano Drive
Sterling Hgts MI 48077
Tel : 313 977 8081

CANADA US $ 12/=
c/o Mr. Anwar H. Qureshi
SSQ 323 Rusholme Rd #1809
Toronto Ont M6H 2 2 2
Tel : 416 531 2902

UK & EUROPE US $ 9/=
c/o Mr. Zahur ul Hasan
18 Garfield Rd Enfield
Middlessex EN 34 RP
Tel : 01 805 8732

MID-EAST DR 25/=
c/o Mr. M. Ashraf Faruq
JKQ P.O. Box 27628
Abdu Dhabi
Tel : 479 192

INDIA US $ 6/=
c/o Mr. Hyder M. D. Ghauri
AKQI 4-1-444, 2nd Floor
Bank St Hyderabad 500 001
Tel : 42127

K S A SR 25/=
c/o Mr. M. Rashid Umar
P O. Box 251
Riyadh 11411
Tel : 476 8177

JEDDAH (only) SR 25/=
IFTIKHAR-UD-DIN
Manarah Market,
Hayy-ul-Aziziyah,
JEDDAH.
TEL: 6702180

D.D./Ch. To, Maktaba Markazi Anjuman Khudam ul Quran Lahore.
U B L Model Town Ferozpur Rd Lahore.

ادارۂ تحریر

شیخ جمیل الرحمٰن
حافظ عاکف سعید
حافظ خالد محمود خضر

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور رجسٹرڈ

مقامِ اشاعت: ۳۶ - کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۵۴۷۰۰ - فون: ۸۵۶۰۰۳-۸۵۶۰۰۴

سب آفس: ۱۱- داؤد منزل، نزد آرام باغ شاہراہ لیاقت کراچی - فون: ۲۱۶۵۸۶

پبلشرز: لطف الرحمٰن خان طابع، رشید احمد چودھری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

عرضِ احوال ——— ۵
عاکف سعید

تذکرہ و تبصرہ ——— ۷
امّتِ مسلمہ کا مستقبل
امیرِ تنظیمِ اسلامی کے خطابِ جمعہ کے متعلقہ حصّے کی تلخیص

دعوت و تحریک ——— ۱۷
تحریکِ اسلامی کے قائد و امیر کے حقوق و اختیارات
مولانا مودودی مرحوم کی ایک اہم تحریر

تبلیغی جماعت، قیامِ پاکستان کے بعد ——— ۳۵
بسلسلہ: تبلیغی جماعت کے ذمہ دار حضرات سے دردمندانہ گزارش (۳)
از قلم: سیّد تنظیم حسین

انتخابِ ندا ——— ۴۵
ندا، پیپلز پارٹی اور جماعتِ اسلامی
اقتدار احمد

افہام و تفہیم ——— ۵۵
کیا احیاءِ اسلام کا خواب نَومُسلم اقوام کے ہاتھوں ہی شرمندۂ تعبیر ہوگا؟
الطاف محمود صاحب کا سوال اور امیرِ تنظیمِ اسلامی کا مفصّل جواب

رودادِ سفر ——— ۷۳
بھارت میں چودہ دن (۲)
مرتّب: شیخ رحیم الدین

اِنْ شَاءَ اللّٰہُ الْعَزِیْز

تنظیمِ اسلامی کے زیرِ اہتمام تربیت گاہ

جو مرکزی

خاص طور پر طلبائے تنظیمِ اسلامی کے لیے مرکزی دفتر میں منعقد ہونے والی تھی

وہ اب

نظریاتی ریفریشر کورس

کی حیثیت سے

۲۲ تا ۲۹ دسمبر ۸۹ء قرآن اکیڈمی میں منعقد ہو گی

جس میں طلبائے تنظیمِ اسلامی کے علاوہ

تنظیم کے جملہ امراء، ناظمین اور نقباء تو لازماً

شریک ہوں گے (الّا یہ کہ کوئی عذرِ شرعی مانع ہو) ان کے علاوہ ان جملہ رفقائے تنظیم کو بھی شرکت کی پُرزور دعوت ہے جو مبتدی اور منتظم تربیت گاہوں میں شمولیت اور اُن کے مجوزہ نصاب کی تکمیل کر چکے ہوں

تاکہ آئندہ سالانہ اجتماع کے موقع پر تنظیمی ڈھانچے کی جو تشکیلِ جدید

پیشِ نظر ہے اس کی ذمہ داریوں کو سنبھالنے کے لیے زیادہ سے زیادہ تعداد میں ایسے منتظم اور فعّال رفقاء تیار ہو جائیں جو کسی نہ کسی درجہ میں

"عَلٰی بَصِیْرَۃٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِی"

کے عکس کے حامل ہوں ——— (ناظمِ اعلیٰ تنظیمِ اسلامی پاکستان)

۱۹۵۶-۵۷ء میں

جماعتِ اسلامی میں جو شدید اختلافات

پیدا ہوئے تھے، جن کے نتیجے میں جماعت کی قیادت کی پوری صفِ دوم نے
جماعت سے علیحدگی اختیار کر لی تھی، اُس کے اصل حقائق و واقعات

ڈاکٹر اسرار احمد

نے ۶۷-۱۹۶۶ء میں سورۂ نحل کی آیت ۹۲ کے الفاظِ مبارکہ:

"وَلَا تَكُونُوا كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ أَنْكَاثًا"

(ترجمہ: اور نہ بن جاؤ اس عورت کے مانند جس نے اپنے مضبوط کاتے ہوئے سوت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا)

سے ماخوذ عنوان **'نقضِ غزل'** کے تحت لکھنے

شروع کیے تھے، جس کی پانچ اقساط اگست ۶۶ء تا فروری ۶۷ء 'میثاق' میں شائع بھی
ہو گئی تھیں لیکن بوجوہ یہ سلسلہ نامکمل رہا تھا، اب اس کی تکمیل کی تمہید کے طور پر اوّلاً

وہ پانچوں اقساط 'میثاق' کے آئندہ شمارے میں یکجا

شائع کر دی جائیں گی، اور ان شاء اللہ اگلے دو شماروں میں اس کی تکمیل کر دی جائے گی جس سے

تاریخ جماعتِ اسلامی

کا ایک گم شدہ باب ——— منظرِ عام پر آ جائے گا

پرچہ اضافی تعداد میں مطلوب ہو تو پیشگی مطلع فرمائیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ احوال

پچھلے شمارے میں امتِ مسلمہ کے عروج و زوال کے موضوع پر امیر تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی ایک اہم تحریر شامل تھی، جو نہ صرف یہ کہ تاریخ بنی اسرائیل کے تناظر میں امتِ مسلمہ کے عروج و زوال کے دُور ادوار کے واقعاتی و تجزیاتی جائزے پر مشتمل تھی بلکہ موجودہ احیائی مساعی کا ایک اجمالی لیکن نہایت متوازن اور حقیقت پسندانہ جائزہ بھی اس میں شامل تھا۔ گویا وہ تحریر امت کے ماضی اور حال دونوں کو محیط تھی ——— لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا تھا امتِ مسلمہ اور اسلام کے مستقبل کے بارے میں کوئی واضح بات اور ٹھوس نقطۂ نظر وہاں زیر بحث نہیں آیا تھا اس لیے کہ امت کے مستقبل کا معاملہ سرے سے وہاں شاملِ موضوع ہی نہیں تھا ——— چنانچہ اس موضوع کی اہمیت کے پیش نظر اور اس خیال کے زیر اثر کہ بحث کا کوئی گوشہ تشنہ نہ رہ جائے امت کے مستقبل کے بارے میں محترم ڈاکٹر صاحب کے خیالات کو اُن کی ایک حالیہ تقریر کے کیسٹ سے صفحۂ قرطاس پر منتقل کر کے ہدیۂ قارئین کیا جا رہا ہے ——— مزید برآں اسی موضوع سے متعلق ایک تقریر نما سوال کے جواب میں امیر محترم کی وضاحتی گفتگو کو بھی مرتب کر کے افہام و تفہیم کے زیر عنوان شاملِ اشاعت کیا گیا ہے، جس سے اس موضوع کے تمام گوشوں کا بڑی خوبصورتی اور جامعیت سے احاطہ ہو جاتا ہے۔

زیر نظر شمارے میں "ندا" پیپلز پارٹی اور جماعت اسلامی کے عنوان سے مدیر 'ندا' کا ایک مضمون شامل ہے جو ہفت روزہ 'ندا' کی ایک حالیہ اشاعت سے ماخوذ ہے۔ قارئین بخوبی آگاہ ہیں کہ 'ندا' ایک سیاسی ہفت روزہ ہے جو اسلام اور پاکستان کے ساتھ گہری وابستگی کی پالیسی پر عمل پیرا اور سنجیدہ و باوقار صحافت کے احیاء کا خواہاں ہی نہیں اس کے لیے کوشاں بھی ہے۔ 'ندا' نے خود کو کبھی تنظیم اسلامی کا آرگن قرار نہیں دیا اور نہ تنظیم کی طرف سے کبھی یہ CLAIM کیا گیا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ مدیر 'ندا' اقتدار احمد صاحب امیر تنظیم اسلامی کے برادرِ خورد ہی نہیں قافلۂ تنظیم اسلامی میں اُن کے شریکِ سفر بھی ہیں۔ وہ غلبہ و اقامتِ دین کے لیے تنظیم اسلامی کے منہجِ عمل اور تصورِ دین سے ہی پورے طور پر متفق نہیں، امیر تنظیم اسلامی کے سیاسی موقف و نظریات

سے بھی ذہناً ہم آہنگی رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ 'ندا' نے ایک آزاد سیاسی ہفت روزے کے طور پر میدانِ صحافت میں قدم رکھا تھا لیکن وہ آغاز ہی سے امیر تنظیم کے قرآنی افکار اور سیاسی موقف کی ترویج و اشاعت میں پیش پیش رہا ہے۔ بہرکیف یہ ایک حقیقت ہے کہ 'ندا' نے ملکی سیاسی اُمور کے بارے میں جو موقف اپنایا ہے وہ اگرچہ ایک حد تک امیر تنظیم اسلامی کے سیاسی موقف سے ہم آہنگ ہے لیکن اس معاملے میں اس کی پالیسی تنظیم اسلامی یا امیر تنظیم کے تابع نہیں بلکہ کلیتہً آزاد ہے ـــــ 'ندا' کے سیاسی موقف کے بارے میں یہ اعتراض تکرار کیا جاتا ہے اور یہ اعتراض بیگانوں کے ساتھ ساتھ بہت سے اپنوں کی زبان پر بھی شکایت بن کر آتا ہے کہ یہ پرچہ پیپلز پارٹی کی غیر ضروری حمایت اور جماعتِ اسلامی کی بے جا مخالفت کی پالیسی اپنائے ہوئے ہے ـــــ 'ندا' کے حوالے سے اس الزام کی زد امیرِ تنظیم اسلامی کے سیاسی موقف پر بھی پڑتی ہے۔ اس لیے کناقدین ہماری تمام تر وضاحتوں اور اظہارِ حقیقت کے باوصف اسے تنظیم اسلامی ہی کا پرچہ قرار دیتے ہیں۔ زیرِ نظر مضمون میں مدیر 'ندا' نے اس اعتراض کے جواب میں کھل کر اظہارِ خیال کیا ہے اور جن بنیادوں پر اُن کے سیاسی موقف کی عمارت استوار ہے، اُن پر وضاحت سے روشنی ڈالی ہے۔ گو اس وضاحتی مضمون کی ابھی پہلی قسط ہی سامنے آئی ہے، تاہم مضمون واقعتہً اس لائق ہے کہ جذبات کو ایک طرف رکھتے ہوئے ٹھنڈے دل سے اس کے مندرجات پر غور کیا جائے۔ ضروری نہیں کہ آپ اُن کی رائے سے صد فی صد اتفاق کریں، تاہم ہمیں چاہیے کہ دوسروں کی اُڑائی ہوئی گرد سے اپنے خیالات کو آلودہ کرنے کی بجائے ہر معاملے کو اس کے صحیح پس منظر میں دیکھنے اور غیر جانبدارانہ انداز میں غور و فکر کر کے اپنی رائے بنانے کی عادت کو پختہ کریں۔ اس لیے کہ جب تک ہم دوسروں کی عینک سے حقائق کو دیکھنے اور اغیار کے پروپیگنڈے سے فوری متاثر ہو جانے کی روش ترک نہیں کریں گے حالات کے وقتی دباؤ کے زیر اثر پراگندگیٔ فکر اور انتشارِ ذہنی کا شکار رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ اس سے ہمیں اپنی امان میں رکھے اور خدمتِ دینی کے کسی مثبت تعمیری کام میں شریک ہو کر مصروفِ عمل ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور خدمت و اشاعتِ قرآن کا ایک ادارہ ہے۔ قارئینِ میثاق، اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ مذکورہ بالا انجمن اور تنظیم اسلامی ایک ہی تصویر کے دو رُخ اور ایک ہی ہمہ گیر تحریک کے دو شعبے ہیں۔ انجمن خدام القرآن ایک وسیع تر ادارہ ہے جو علومِ قرآنی کی نشر و اشاعت کے لئے تشکیل دیا گیا تھا۔ اور تنظیم اسلامی اُن مردانِ کار پر مشتمل

(باقی صفحہ ۷ پر)

امّتِ مسلمہ کا مستقبل

امیر تنظیم اسلامی کے خطابِ جمعہ کے متعلقہ حصّے کی تلخیص

ترتیب وتسوید: حافظ خالد محمود خضر

امّتِ مسلمہ کے ماضی اور حال کے تذکرہ کے بعد اب میری خواہش یہ ہے کہ میں مستقبل کے بارے میں بھی چند باتیں آپ کے سامنے رکھ دوں۔ مستقبل کے بارے میں دو باتیں سمجھ لیجئے۔ ایک ہے مستقبلِ بعید، ایک ہے مستقبلِ قریب۔ اصولی طور پر ترتیب تو یہ ہونی چاہیئے کہ ماضی کے بعد حال اور حال کے بعد پہلے مستقبلِ قریب اور پھر مستقبلِ بعید ——— لیکن اسے مصلحت کہہ لیجیے یا حکمت کہہ لیجیے کہ جس کے تحت میں مستقبلِ بعید کو پہلے لا رہا ہوں۔ مستقبل بعید کے بارے میں مجھے یہ یقین حاصل ہے اور یہ میرے ایمان کا جزو ہے کہ پورے کرّۂ ارضی پر اسلام کا غلبہ ہو کر رہے گا۔ یہ وہ تقدیرِ مبرم ہے جو ہو کر رہے گی۔ اور میں اسے بہت بعید بھی نہیں دیکھ رہا، یہ بہت دور کی بات نہیں ہے۔ اس کی خبر دی ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے۔ وھو الصّادق المصدوق۔ آپ نے ارشاد فرمایا: لَا یَبْقٰی عَلٰی ظَھْرِ الْاَرْضِ بَیْتُ مَدَرٍ وَّلَا وَبَرٍ اِلَّا اَدْخَلَہُ اللّٰہُ کَلِمَۃَ الْاِسْلَامِ بِعِزِّ عَزِیْزٍ اَوْ بِذُلِّ ذَلِیْلٍ ذرا اندازہ تو کیجئے کہ کس قدر دوٹوک اور CATEGORICAL الفاظ میں اُس ہستی کے جو "افصح العرب" ہے۔ فرمایا: لَا یَبْقٰی عَلٰی ظَھْرِ الْاَرْضِ بَیْتٌ "اس روئے ارضی پر کوئی گھر باقی نہیں رہے گا"! اور گھر بھی دو طرح کے ہیں: وَبَرٍ ولا مَدَرٍ نہ کمبلوں کا بنا ہوا کوئی خیمہ بچے گا اور نہ ہی اینٹ گارے سے بنا ہوا کوئی گھر باقی رہے گا جس میں کہ اسلام داخل نہ ہوگا۔ البتہ اسلام کا داخلہ دو شکلوں میں ہوگا۔ یا گھر والوں کے اعزاز کے ساتھ یا گھر والوں کی تذلیل کے ساتھ: بِعِزِّ عَزِیْزٍ اَوْ بِذُلِّ ذَلِیْلٍ۔ یا تو گھر والے اسلام قبول کریں گے اور اس طرح اسلام اس گھر میں ان کے اعزاز کے ساتھ داخل ہوگا۔ از روئے آیتِ قرآنی: وَلِلّٰہِ الْعِزَّۃُ وَلِرَسُوْلِہٖ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ "اور عزت تو اللہ کے لئے، اس کے رسول کے لئے اور اہل ایمان کے لیے

ہے "۔ اور اگر قبول نہیں کریں گے تو اسلام پھر بھی داخل ہوگا لیکن ان کی تذلیل کے ساتھ۔ انہیں چھوٹا ہو کر رہنا پڑے گا، ہاتھ سے جزیہ دینا ہوگا۔ یُعْطُوا الْجِزْیَۃَ عَنْ یَّدٍ وَّھُمْ صٰغِرُوْنَ۔ یہ ہے خبر رسول اللہؐ کی دی ہوئی۔ آپ کی کوئی خبر جھوٹی نہیں ہو سکتی۔

کرۂ ارضی پر غلبۂ اسلام کا اشارہ قرآن حکیم میں بھی موجود ہے۔ میں قرآنِ حکیم کی دو محکم آیات سے منطق کے ذریعے سے یہ ثابت کرتا ہوں کہ یہ ہو کر رہے گا۔ ایک محکم آیت تو وہ ہے کہ حضورؐ کو بھیجا گیا تمام نوعِ انسانی کے لیے بشیر و نذیر بنا کر: وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا۔ اور دوسری محکم آیت وہ ہے کہ حضورؐ کو بھیجا گیا دینِ حق اور الھدیٰ دے کر تاکہ یہ غالب ہو: ھُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۔۔۔ اب ان دونوں آیات سے صغریٰ کبریٰ جوڑ لیجیے تو نتیجہ یہ برآمد ہوگا کہ پورے کرۂ ارضی پر، پورے عالمِ انسانی پر اللہ کا دین غالب ہو کر رہے گا۔ اس کو میں مستقبلِ بعید کہہ رہا ہوں اور میں نے عرض کیا کہ یہ زیادہ بعید نہیں ہے۔ اس لئے کہ قربِ قیامت کی جو نشانیاں اور احوال احادیث میں آئے ہیں ان کی روشنی میں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ڈرامے کے لیے سٹیج تیار کیا جاتا ہے، حالات خود بخود اس رُخ پر جا رہے ہیں۔ بہرحال اس وقت میں تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ اس کے ضمن میں ایک بات اور کہوں گا کہ اسلام کا یہ عالمی غلبہ کہاں سے شروع ہوگا، یہ ہم نہیں جانتے۔ عین ممکن ہے کہ جیسے ایک مرتبہ پہلے ہو چکا، اسی طرح مسلمانوں کو ان کی بدکرداری اور غدّاری و بے وفائی کی سزا کسی دوسری قوم کے ہاتھوں دلوا کر اُسی قوم کے ہاتھ میں اللہ تعالیٰ اپنے دین کا جھنڈا تھما دے، جیسے فتنۂ تاتار میں ہُوا ؎

ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

اور میں حیران ہوتا ہوں کہ علامہ اقبال نے کس کیفیت میں یہ شعر کہا تھا، اگرچہ اس علاقے سے اس کے آثار ابھی نظر نہیں آ رہے ؎

از خاکِ سمرقندے، ترسم کہ دگر خیزد
آشوبِ بلاکوئے، ہنگامۂ چنگیزے

بہرحال اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ عالمِ اسلامی کے حالات دیکھ کر تو سوائے مایوسی کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ لیکن اللہ کی رحمت سے کچھ بعید نہیں کہ انہی میں سے کسی مُردہ قوم کو زندہ کر دے۔ جس طرح یہودیوں میں سے اللہ نے ان کے احیاء کی شکل پیدا کر دی تھی، آج

بھی کسی مسلمان قوم کو توفیق دے کہ اس میں دوبارہ زندگی ہو جائے: اَنَّ اللّٰہَ یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِھَا۔ حضرت عزیرؑ حیران ہو گئے تھے کہ اللہ تعالیٰ اس بستی کو کیسے زندہ کرے گا اور اللہ نے بستی کو دوبارہ آباد کر دیا۔ اگر یہ دوسری صورت ہو تو میرے نزدیک اس کی سب سے زیادہ امید پاکستان سے ہے۔ فی الوقت حالات اگرچہ مایوس کن ہیں لیکن اس کا جو تاریخی پس منظر ہے، اور وہ میں اپنی کتاب استحکام پاکستان میں تفصیل سے لکھ چکا ہوں، وہ اس پر شاہد ہے کہ اس خطے سے کوئی عظیم کام لیا جائے گا۔ پچھلی چار صدیوں میں جتنے مجددین آئے ہیں وہ اسی خطے میں آئے ہیں۔ مجدد الف ثانیؒ، شاہ ولی اللہ دہلویؒ، اور سید احمد شہیدؒ جیسی عظیم شخصیتیں اسی خطے میں پیدا ہوئیں۔ تحریک شہیدین جیسی خالص اسلامی جہاد کی تحریک اور اس دور میں بھی عظیم ترین احیائی تحریکیں یہیں سے ابھریں۔ اور پاکستان کی تحریک آزادی وہ واحد قومی تحریک تھی جس میں اسلام کا نام لیا گیا۔ باقی تو کہیں نام بھی نہیں لیا گیا۔ اس کا ایک مظہر ان دنوں آپ کے سامنے اور بھی آیا ہے کہ ہماری موجودہ مرکزی حکومت بھی تھوڑی تھوڑی مشرف بہ اسلام ہو رہی ہے۔ ان کی طرف سے جس قسم کے نعرے شروع میں لگے تھے اب ان کا اعادہ نہیں ہو رہا۔ حالات کے جبر نے مجبور کیا ہے کہ اب وہ بھی اسلام کا نام لینے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ یہ میرے نزدیک تاریخ کا جبر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس ملک کا کوئی جواز نہیں ہے سوائے اسلام کے۔ کوئی شخص، کوئی جماعت، کوئی پارٹی، غرض کوئی قیادت یہاں پر آجائے، اگر وہ اس ملک کو برقرار رکھنا چاہے گی تو اس کو نظر آجائے گا کہ اسلام کے سوا کوئی بات نہیں چل سکتی۔ چاہے وہ منافقانہ طور پر اسلام کا نام لے، اسے لینا پڑے گا۔ اور اسلام کا کام کرنے کے لئے بھی جیسے سازگار حالات اس ملک میں ہیں، کہیں اور نہیں۔ پچھلے دنوں جماعت اسلامی کی جانب سے ایک بیان پر بعض حضرات سخت چیں بجبیں ہوئے لیکن بات بہت سچی کہی گئی ہے کہ جس قدر آزادی آپ کو اس ملک میں حاصل ہے پورے عالم اسلام میں کہیں نہیں۔ آپ کام نہ کریں تو یہ آپ کا جرم ہے۔ آپ کے کام کرنے میں کوئی رکاوٹ تو نہیں۔ آپ دین کے لئے محنت نہ کریں تو آپ مجرم ہیں۔ اگر آپ کہیں شام کے اندر ہوتے تو پتہ چل جاتا کہ اسلام کا نام لینے کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ اگر کہیں ترکی میں، مصر میں یا لیبیا میں ہوتے تو پتہ چلتا کہ اسلام کا نام کیسے لیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر سعودی عرب میں ہوتے تو پتہ چل جاتا کہ کہیں چار آدمی بھی جمع ہو جاتے تو جو کھلبلی مچتی حکومت کی سطح پر اس کا آپ کو اندازہ ہے۔ اسی طرح

سخت جبر ہے انڈونیشیا میں۔ یہاں آزادی ہے مگر ہم کام نہیں کر رہے ہیں۔ ہم لگے ہوئے ہیں اپنے اپنے دھندوں میں، اپنے اپنے کاروباروں میں، اپنی اپنی جائیدادوں کے بنانے میں۔

مستقبل بعید کے بارے میں میں نے جو باتیں عرض کی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ کرۂ ارضی پر اسلام کا غلبہ ہو کر رہے گا۔ اس کے لئے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام مسلم اقوام کو رد کر کے کسی دوسری قوم کو لے آئے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مسلم ممالک میں سے کسی کے اندر جان پیدا ہو جائے۔ اگر ایسا ہو تو جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس کے سب سے زیادہ امکانات اس خطۂ ارضی میں ہیں جس کا نام پاکستان ہے اور جس میں میں اور آپ سانس لے رہے ہیں۔

مستقبل قریب کا معاملہ البتہ بہت تشویش ناک ہے۔ احیائی تحریکوں کا جو معاملہ ہے وہ میں آپ کے سامنے رکھ چکا ہوں۔ انقلاب ایران کے بارے میں بھی میں عرض کر چکا ہوں کہ یہ اگرچہ شیعہ انقلاب تھا، لیکن اس نے دنیا میں ہلچل برپا کر دی تھی۔ کیونکہ دنیا تو بہرحال اسے اسلامی انقلاب ہی سمجھی تھی۔ اس انقلاب سے مغرب کو جو خطرہ لاحق ہو گیا تھا اب وہ ختم ہو چکا ہے۔ وہ انقلاب اب اپنے خول کے اندر ہے۔ اب ان کی ایک "شیطان" یعنی روس کے ساتھ دوستی ہو چکی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ حالات کا جبر مجبور کرے تو دوسرے "شیطان" یعنی امریکہ کے ساتھ بھی دوستی ہو جائے۔ پہلے ان کا نعرہ "مرگ بر امریکا" بھی تھا اور "مرگ بر روسیا" بھی۔ یعنی امریکہ بھی مُردہ باد اور روس بھی مُردہ باد۔ لیکن اب وہاں روس پر مرگ کا معاملہ نہیں ہے، یہ نعرہ اب ترک کر دیا گیا ہے۔ مغربی تہذیب و تمدن کو دوسرا بڑا اندیشہ افغانستان کے جہاد سے تھا۔ اس کا بھی جو حال ہے، سب کے سامنے ہے۔ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ کوئی بہتر شکل پیدا کر دے تو اس کی قدرت سے بعید نہیں۔ اور بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی کو نظر نہیں آ رہا ہوتا اور اچانک کوئی بات ظہور میں آ جاتی ہے۔ لیکن اس وقت جو صورتحال ہے اور اس کا جو نتیجہ ہے وہ میں اپنی دو جمعہ قبل کی تقریر میں عرض کر چکا ہوں کہ مغرب میں اب یہ سمجھا جا رہا ہے کہ بنیاد پرست (FUNDAMENTALIST) اسلام کے برسر اقتدار آنے کا کوئی خطرہ نہیں رہا۔

اس تشویش کا تیسرا اور سب سے بڑا مظہر پاکستان ہے جہاں گذشتہ نصف صدی کے دوران سب سے زیادہ اسلام کا نام لیا گیا۔ ۱۹۳۷ء سے اب تک باون برس ہو گئے ہیں،

اس دوران اسلام کا نعرہ جتنا یہاں لگا، کہیں اور نہیں لگا۔ لیکن اسلامی معاشرے کی تشکیل کے لئے عملاً کیا پیش رفت ہوئی؟ حالات تو یہ سامنے آئے ہیں کہ مارشل لاء کا ڈھکن جو اوپر سے رکھ دیا گیا تھا، جب وہ اٹھا تو اندر سے بے نظیر کی حکومت برآمد ہوئی۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان میں ایک مغربی تہذیب کی دلدادہ، آزاد خیال، سیکولر حکومت قائم ہوگئی۔

مغرب پر اس وقت خوشی کا ایک نشہ طاری ہے اور اسی نشے کی وجہ سے بے نظیر صاحبہ کا امریکہ میں بے نظیر استقبال ہوا۔ وہ تو اسے اپنی فتح سمجھ رہے ہیں، اسے اپنی تہذیب و تمدن کی بالادستی سمجھ رہے ہیں۔ وہ ملک جو اسلام کے نام پر قائم ہوا وہاں پیپلز پارٹی کا برسر اقتدار آنا اور بے نظیر کا وزیر اعظم بن جانا گویا مغربی تہذیب کی بالادستی کا ثبوت ہے اور ایسا نہیں ہے کہ اسے کسی نے اوپر سے لاکر بٹھا دیا ہو۔ ہم میں سے کم سے کم ساٹھ لاکھ افراد نے اسے ووٹ دیا ہے۔ آپ کے ووٹر ساڑھے چار کروڑ کے قریب ہیں۔ جتنے ووٹ ڈالے گئے ان میں سے ۳۹ فیصد ووٹ پیپلز پارٹی کے ہیں۔ اس اعتبار سے مستقبل قریب میں آثار اچھے نہیں ہیں۔

عالم اسلام میں احیائی تحریکوں نے جو جوش و خروش پیدا کر دیا تھا، اس سے ایک بڑی امید افزا کیفیت پیدا ہوگئی تھی وہ اب باقی نہیں رہی۔ افغانستان کے جہاد سے بڑی امیدیں پیدا ہوگئی تھیں جواب دم توڑ گئی ہیں۔ اس جہاد میں عظیم قربانیاں دی گئی ہیں۔ سعودی عرب سے یہاں آکر نوجوانوں نے جانیں دی ہیں۔ اپنے ملک میں وہ حرکت نہیں کر سکتے، بول نہیں سکتے، لیکن دین کا جذبہ تو اُن کے سینوں میں موجزن ہے نا، جو انہیں کشاں کشاں یہاں لے آتا ہے۔ حالانکہ ان کے ہاں دولت کی کمی نہیں ہے، یہ نہیں کہ ان کے ہاں عیش و آرام کی فراوانی نہ ہو۔ اور نہ معلوم کہاں کہاں سے مسلمان یہاں پہنچے ہیں اور اس جہاد میں اپنی جانیں دی ہیں۔ پوری دنیا کے اندر یہ سمجھا گیا کہ اب یہ خطہ درحقیقت اسلام کے احیاء کا، اسلام کی نشأۃ ثانیہ کا اور ایک خالص اسلامی حکومت کے قیام کا نقطۂ آغاز بنے گا۔ لیکن اب تک جو حالات سامنے آئے ہیں وہ مایوس کن ہیں۔ اس کا سبب بھی میں بتا چکا ہوں کہ ایک بڑی کمی یہ رہی ہے کہ مجاہدین ایک کمانڈ میں نہیں آئے۔ وہ جو حضورؐ نے فرمایا تھا: " آمُرُكُمْ بِخَمْسٍ بِالْجَمَاعَةِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَالْهِجْرَةِ وَالْجِهَادِ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ "، اس کو تمام و کمال پیش نظر نہیں رکھا گیا۔ ہجرت بھی ہوئی اور جہاد بھی ہوا لیکن الجماعۃ والسمع والطاعۃ کو نظر انداز

کیا گیا ۔ مجاہدین کے پندرہ کے قریب گروپ ہیں جو اُس دوران بھی آپس میں جھگڑتے رہے تھے ۔ اور پھر جو کچھ ہُوا ہے وہ سامنے آچکا ہے ۔ سیرت النبیؐ کے حوالے سے میں بار بار عرض کر چکا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی حیاتِ طیبہ میں جو سب سے بڑا صدمہ پہنچا وہ غزوۂ احد میں پہنچا ذاتی اعتبار سے بھی کہ دندانِ مبارک شہید ہوئے ، چہرۂ مبارک لہولہان ہو گیا ، جس پر آپؐ کی زبانِ مبارک سے یہ الفاظ نکل گئے : کَیْفَ یَھْدِی اللّٰہُ قَوْمًا خَضَبُوْا وَجْہَ نَبِیِّھِمْ بِالدَّمِ " اللہ اس قوم کو کیسے ہدایت دے گا جس نے اپنے نبیؐ کے چہرے کو خون سے رنگین کر دیا " اور اللہ نے ٹوک دیا : لَیْسَ لَکَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ اَوْ یَتُوْبَ عَلَیْھِمْ اَوْ یُعَذِّبَھُمْ ۔ یعنی اے نبیؐ ، آپ کے ہاتھ میں کوئی اختیار نہیں ہے ، یہ اختیار ہمارا ہے کہ ہم ان کو توبہ کی توفیق دے دیں یا عذاب دیں ـــــ چنانچہ اُسی خالد بن ولید کو اللہ نے حضورؐ کے ہاتھوں تلوار عطا فرمادی اور " سَیْفٌ مِنْ سُیُوْفِ اللّٰہِ " کا لقب عطا فرمادیا جو اس صدمے کا سب سے بڑا سبب بنے تھے ۔ ستر صحابہ کرامؓ کی شہادت حضورؐ کے لیے بڑا عظیم صدمہ تھی ـــــ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت ، حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کی شہادت ۔ وہ مصعبؓ کہ جن کی دعوت و تبلیغ سے یثرب مدینۃ النبیؐ بنا تھا ، اور دیگر ساتھیوں کی شہادت ـــــ اور یہ سب کس لئے ہوا ؟ اسی لیے نا کہ سینتیس افراد نے حکم عدولی کی اور اس کے نتیجے میں ستر صحابہؓ شہید ہو گئے ۔ یہ اتنی بڑی بات ہے ۔ اس لیے میں کہا کرتا ہوں کہ صحیح معنوں میں جماعت بنانا اصل ضرورت ہے اور یہ ایک مشکل اور کٹھن کام ہے ۔ اپنی انانیت کو زیر کرنا پڑتا ہے تب جماعت بنتی ہے ۔ خیر یہ اپنی جگہ پر ایک مسئلہ ہے ۔

ان حالات میں قرآن حکیم ہمارے لئے کیا رہنمائی فراہم کرتا ہے ، اسے سمجھنے کی ضرورت ہے ۔ اپنے آج کے خطاب کے آغاز میں میں نے سورۂ بنی اسرائیل کی جو آیات تلاوت کی تھیں ، ان میں بنی اسرائیل کے عروج و زوال کے چار ادوار کا تذکرہ کرنے کے بعد فرمایا گیا : عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ یَّرْحَمَکُمْ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا وَجَعَلْنَا جَھَنَّمَ لِلْکٰفِرِیْنَ حَصِیْرًا ۝ یعنی تمہارا رب اب بھی تم پر رحمت کرنے کے لئے تیار ہے ، لیکن اگر تم نے وہی روش جاری رکھی تو ہم بھی اسی طرح عذاب کے کوڑے برساتے رہیں گے اور جہنم کو تو ہم نے پہلے ہی کافروں کے لئے تیار کیا ہوا ہے ۔ آگے رحمتِ خداوندی میں آنے کا راستہ

دکھادیا۔ اگر رحمتِ خداوندی میں آنا چاہتے ہو تو کیا کرو ـــــ !؟ یہاں عجیب نکتہ ہے۔ رحمتِ خداوندی میں آنے کا راستہ تو یہ تھا کہ رسالتِ محمدیؐ پہ ایمان لاؤ۔ لیکن یہاں حضورؐ کا ذکر نہیں کیا، قرآن کا ذکر کیا۔ اس لئے کہ جب امتِ مسلمہ پہ یہ مرحلہ آئے گا تو حضورؐ پر ایمان تو انہیں پہلے ہی سے نصیب ہوگا۔ مسلمان تو وہ پہلے ہی سے ہوں گے۔ اُن کے لئے پیروی قرآن کا دامنِ رحمت ہوگا کہ احیائے اسلام کے لیے جس کو تھامنا ضروری ہوگا۔ اگرچہ یہ دونوں چیزیں ایک ہی ہیں۔ قرآن اور محمدؐ جدا نہیں ہیں۔ یہ قرآنِ متلو ہے، وہ قرآنِ مجسّم ہیں، لیکن یہاں ذکر کس شئے کا ہو رہا ہے: إِنَّ هَٰذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ "بیشک یہ قرآن ہے جو ہدایت دیتا ہے اُس راستے کی طرف جو سب سے سیدھا ہے"۔ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِينَ الَّذِينَ يَعْمَلُونَ الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ أَجْرًا كَبِيرًا ۝ "اور بشارت دیتا ہے اُن اہلِ ایمان کو جو نیک عمل کرتے ہیں کہ ان کے لئے بہت بڑا اجر ہے۔" وَأَنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ أَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ۝ "اور ساتھ ہی خبردار کرتا ہے کہ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لائیں گے ان کے لئے ہم نے دردناک عذاب مہیا کیا ہوا ہے۔" چنانچہ میرے اور آپ کے لئے قرآن کا پیغام تو یہ ہے کہ اس کے دامن سے وابستہ ہو کر غلبۂ اسلام کے لیے جدّوجہد کریں۔ اسلام نے جو نظامِ عدلِ اجتماعی دیا ہے، جو سیاسی حرّیت عطا کی ہے، جو عدل پر مبنی معاشی نظام دیا ہے، اسے قائم کرنے کے لئے جدوجہد کرنا پڑے گی۔ کاش کہ ہم اس ملک میں اس کے مؤسس قائدِاعظم مرحوم کے الفاظ کے مصداق عہدِحاضر میں اسلام کے اصولِ حرّیت واخوّت ومساوات کا ایک نمونہ دنیا کے سامنے پیش کرسکیں۔ جس طرح سمندروں کے اندر جہازوں کو چٹانوں سے بچانے کے لیے بہت اونچا لائٹ ہاؤس ہوتا ہے کاش کہ یہ پاکستان اسی طرح حقیقی اسلامی نظام کا گہوارہ بنے۔ یہاں اسلامی انقلاب برپا ہو جو پورے عالم میں غلبۂ اسلام کی تمہید بن سکے۔ اس کے لیے اللہ تعالےٰ مجھے اور آپ کو تن من دھن لگادینے کا عزم کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اقول قولی ھٰذا واستغفراللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات۔

••○••

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا

اے ہمارے رَبّ، اگر ہم بھول جائیں یا چُوک جائیں تو (ان گناہوں پر) ہماری گرفت نہ فرما۔

رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ

اور اے ہمارے رَبّ، ہم پر ویسا بوجھ نہ ڈال جیسا تو نے اُن لوگوں پر ڈالا

عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا

جو ہم سے پہلے ہو گزرے ہیں۔

رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ

اور اے ہمارے رَبّ، ایسا بوجھ ہم سے نہ اٹھوا جس کے اُٹھانے کی طاقت ہم میں نہیں ہے۔

وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا

اور ہماری خطاؤں سے درگذر فرما، اور ہم کو بخش دے اور ہم پر رحم فرما۔

اَنْتَ مَوْلٰنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝

تو ہی ہمارا کارساز ہے۔ پس کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد فرما۔

ہمیں توبہ کی توفیق عطا کر دے

ہماری خطاؤں کو اپنی رحمتوں سے ڈھانپ لے

الداعی الی الخیر: میاں عبدالواحد
بھگوان سٹریٹ
پرانی انارکلی لاہور

تحریکِ اسلامی کے قائد و امیر کے حقوق و اختیارات کے موضوع پر مولانا مودودیؒ کی ایک اہم تحریر

(بشکریہ ہفت روزہ 'آئین' لاہور)

جماعتِ اسلامی کے صحافتی حلقے کا ایک جریدہ ہفت روزہ 'آئین' آج کل ماہانہ شائع ہو رہا ہے۔ اس کی اشاعت بابت ربیع الاول ۱۴۱۰ھ میں جماعتِ اسلامی پاکستان کے اجتماعِ ارکان منعقدہ فروری ۱۹۵۷ء بمقام ماچھی گوٹھ کا ذکر آیا ہے۔ اور اس کے ضمن میں مولانا مودودی مرحوم کی ایک تقریر شائع کی گئی ہے جو 'مبیّنہ طور پر' مولانا موصوف نے ماچھی گوٹھ کے کُل پاکستان اجتماعِ ارکان میں کی تھی۔

ماچھی گوٹھ کے اجتماع پر ان سطور کی تحریر کے وقت تقریباً ثلث صدی بیت چکی ہے۔ اس عرصے کے دوران بہت سا پانی وقت کے دریا میں بہہ چکا ہے، چنانچہ نہ صرف مولانا مودودی بلکہ اجتماع کے ناظم و صدر یعنی چوہدری غلام محمد سمیت بہت سی شخصیتیں راہیِ ملکِ بقا ہو چکی ہیں۔ (اللہ ان سب کی مغفرت فرمائے)۔ اور بہت سی باتیں طاقِ نسیان کے حوالے ہو چکی ہیں۔ بنا بریں واقعات کی تفاصیل کے ضمن میں کوئی تسامح بعید از قیاس نہیں تاہم جماعتِ اسلامی سے منسلک کسی شخص سے، بالخصوص جبکہ وہ اجتماع میں شرکت کا دعویدار بھی ہو، ایسی فاش غلطی حیرت انگیز ہے کہ ایک ایسی تقریر کو ماچھی گوٹھ کے ارکانِ جماعت کے اجتماعِ عام سے منسوب کر دیا گیا ہے جو وہاں کسی محدود اور منتخب نشست میں ہوئی ہو تو دوسری بات ہے، جملہ ارکان جماعت کے کھلے اجلاسِ عام میں ہرگز نہیں ہوئی!

تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ مضمون نگار ۱۹۵۶-۵۷ء کے بحرانی دور میں جماعت کے مرکزی دفتر میں بطور ٹائپسٹ ملازم تھے اور مولانا مودودی کی اس تقریر کا مسوّدہ انہوں نے خود ٹائپ کیا تھا جواب انہیں کہیں پرانے کاغذات میں دستیاب ہوگیا ہے، چنانچہ گمان غالب یہ ہے کہ ایک تہائی صدی قبل کی پوری تفاصیل تو انہیں یاد نہیں رہیں، تاہم انہوں نے خیال کیا کہ جب ایک تقریر اس اہتمام سے لکھی ہی نہیں، ٹائپ بھی کرائی گئی تھی تو بالفعل اجتماع میں کی بھی گئی ہوگی۔ چنانچہ اس کے ساتھ کچھ سابقہ اور لاحقہ اپنے تصوّر کے بل پر لگا کر انہوں نے اسے آب و تاب سے شائع کر دیا۔ واللہ اعلم!!

اس 'سابقہ' اور 'لاحقہ' میں جو کرم فرمائی انہوں نے اُن لوگوں پر کی ہے جنہوں نے اُس موقع پر مولانا مودودی کی بعض آراء اور اقدامات سے اختلاف کیا تھا، اور جو سبّ و شتم اور رکیک حملے ان کی شخصیتوں پر روا رکھے ہیں، ان سے قطع نظر، مولانا مرحوم کی اس 'تحریر' کی اشاعت کے لئے ہم مضمون نگار کے شکر گذار ہیں۔ اس لئے کہ اس کے ذریعے تحریکِ اسلامی کے قائد و امیر کے حقوق و اختیارات کے ضمن میں مولانا مرحوم کا ذہن پوری طرح واضح ہو کر سامنے آگیا ہے!

اور چونکہ یہ ایک ایسا اہم اور بنیادی مسئلہ ہے جس سے اقامتِ دین کی جدّوجہد کرنے والی ہر جماعت اور تنظیم کو لازماً سابقہ رہتا ہے، لہٰذا ہم اسے من و عن، شائع کر رہے ہیں، تاکہ اس اہم مسئلے کے بارے میں دورِ حاضر کے ایک معروف داعیٔ اسلام اور قائدِ تحریکِ اسلامی کے تصوّرات سب کے سامنے آجائیں۔

اس سلسلہ میں یہ بات واضح رہنی چاہئیے کہ ہم سردست نہ ان خیالات و نظریات کی تصویب و تائید کر رہے ہیں، نہ تردید و تنقیص، بلکہ اس وقت ان کی اشاعت سے غرض صرف یہ ہے کہ ایک جانب ایک تاریخی دستاویز "تحریکِ جماعتِ اسلامی" کے مؤرّخین و محققین کے لئے محفوظ ہو جائے، اور دوسری جانب اقامتِ دین کی جدّوجہد کے تنظیمی تقاضوں کے موضوع پر غور و فکر کرنے والوں کے سامنے ایک انتہائی رائے جملہ دلائل کے ساتھ آجائے ——

رہا اس پر مفصل 'محاکمہ' تو وہ ہم ان شاء اللہ عنقریب "نقضِ غزل" کے ضمن میں کریں گے، جس کی اشاعت کا خیال تو بار بار آتا رہا، لیکن تا حال نوبت نہیں آسکی تھی ـــــ اور شاید کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے یہی 'خیر' صاحب مضمون کی متذکرہ بالا 'کرم فرمائی' میں مضمر ہو کہ اب اصل حقائق کے چہرے سے پردہ اٹھانے کا جواز ہی نہیں شدید تقاضا خود جماعت اسلامی کی جانب سے پیدا ہوگیا ہے۔ چنانچہ ابتداءً آئندہ ہی شمارے میں "نقضِ غزل" کی وہ پانچ اقساط یکجا شائع کردی جائیں گی جو اگست ۱۹۶۶ء تا فروری ۱۹۶۷ء 'میثاق' میں شائع ہوئی تھیں۔ اور اس کے بعد ان شاء اللہ العزیز اس پرانے 'قرض' کو اگلے دو تین شماروں میں بے باق کر دیا جائے گا۔

اس تحریر کے بارے میں جو مغالطہ 'آئین' کے مضمون نگار کو لاحق ہوا ہے اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب جائزہ کمیٹی کے ارکان کے خلاف مولانا مودودی کی چارج شیٹ اور اس پر ان کے اصرار کی بنا پر مولانا امین احسن اصلاحی نے احتجاجاً جماعت کی رکنیت سے استعفاء دیا ـــــ اور اس پر "جوابِ آں غزل" کے طور پر مولانا مودودی مرحوم امارتِ جماعت سے مستعفی ہو گئے تو فطری طور پر ملک کے طول و عرض میں جماعت کے پورے حلقے میں ایک شدید بحرانی کیفیت پیدا ہوگئی، جس کے حل کے لیے بالآخر یہ طے پایا کہ جماعتِ اسلامی کی پالیسی اور ہیئتِ تنظیمی کے بارے میں جو اختلافِ رائے جماعت کے اربابِ حل و عقد کے مابین پایا جاتا ہے اس کا فیصلہ کرنے کے لئے جماعت کا ایک کُل پاکستان اجتماعِ ارکان طلب کیا جائے اور وہاں کھلی بحث و تمحیص کے بعد آخری فیصلے کر لیے جائیں ـــــ چنانچہ اجتماعِ ماچھی گوٹھ کا اعلان ہوگیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس اجتماع میں جماعتِ اسلامی کے امیر اور قائد کے حقوق و اختیارات کے موضوع پر اپنے خیالات کے مفصل اظہار کے لیے مولانا نے یہ تحریر تیار کر لی تھی، ـــــ لیکن بعد میں ہوا یہ کہ جماعت کے

بعض اہم ارکان کے علاوہ باہر کے بھی بعض حضرات بالخصوص مولانا ظفر احمد انصاری بیچ میں پڑ گئے اور انہوں نے صلح صفائی کی کوشش کی۔ چنانچہ ماچھی گوٹھ میں اجتماعِ ارکان سے متصلاً قبل مرکزی مجلس شوریٰ کا اجلاس منعقد ہوا اور اس میں جہاں تک پالیسی کا تعلق ہے دوبارہ ایک مصالحتی قرارداد تیار کر لی گئی جسے ارکانِ جماعت کے اجتماعِ عام میں شوریٰ کے ترجمان کی حیثیت سے مولانا مودودی نے پیش کیا۔ (یہ دوسری بات ہے کہ اس مصالحتی قرارداد کا حشر بھی وہی ہوا جو اس سے قبل دسمبر ۵۶ء کی شوریٰ کی 'متفقہ قرارداد' کا ہو چکا تھا، تاہم اس تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے، ان شاء اللہ یہ تمام باتیں "نقضِ غزل" سے واضح ہو جائیں گی۔) رہا دوسرا معاملہ یعنی امارتِ جماعت سے مولانا مودودی کے استعفے اور اس سے منسلک امیر کے اختیارات و حقوق کا مسئلہ تو اس کے ضمن میں مولانا مرحوم نے یہ تجویز پیش کی کہ اسے تمام ارکان کے اجتماع میں زیرِ بحث لانے کی بجائے بہتر ہے کہ جماعت کے تمام تنظیمی حلقوں سے دو دو ارکان منتخب کر لئے جائیں جن کے سامنے میں اپنے خیالات رکھ دوں۔ اگر وہ مجھ سے متفق ہو گئے اور مجھے دستورِ جماعت میں حسبِ منشاء تبدیلی کرنے کا اختیار مل گیا تو میں اپنا استعفاء واپس لے لوں گا۔ اس مختصر اور محدود اجتماع میں (جو ہرگز بیس پچیس شرکاء سے زیادہ پر مشتمل نہیں ہو سکتا) یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مولانا نے اپنی یہ پوری تحریر پیش کی ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کا خلاصہ بیان کر دیا ہو ـــــ بہرحال جماعت کے تمام ارکان کے اجتماعِ عام میں یہ مسئلہ زیرِ بحث ہی نہیں آیا اور چونکہ علاقائی بنیادوں پر منتخب ہونے والی اس مجلس میں (جسے بعد میں مولانا امین احسن اصلاحی نے "خلوتیانِ راز" سے تعبیر کیا) مولانا مودودی کی کسی رائے سے اختلاف رکھنے والے کسی شخص کی شمولیت خارج از امکان تھی، لہٰذا مولانا اصلاحی سمیت وہ تمام ارکانِ جماعت جو مولانا مودودی کی آراء سے اختلاف رکھتے تھے اجتماعِ ماچھی گوٹھ کے دوران مولانا کی اس تقریر یا اُس کے مندرجات و مشمولات سے بالکل بے خبر رہے، چنانچہ خود راقم الحروف کے علم میں یہ 'تقریر' یا 'تحریر' اب پہلی بار آئی ہے!

یہی وجہ ہے کہ مولانا اصلاحی کے علم میں بھی مولانا مودودی کے یہ نظریات اس وقت آئے جب اجتماع ماچھی گوٹھ کے فوراً بعد مرکزی مجلس شوریٰ کا پہلا اجلاس کوٹ شیر سنگھ میں منعقد ہوا اور اس میں مولانا مودودی نے اپنے خیالات اپنی اسی تحریر کے ذریعے یا اس کے مواد پر مشتمل تقریر کے ذریعے پیش کئے (اس لئے کہ اگرچہ مولانا اصلاحی ماچھی گوٹھ میں حلقہ وار بنیاد پر منتخب ہونے والی اس خاص "مجلس نمائندگان" میں تو شامل نہ تھے لیکن بعد میں جب آئندہ کے لئے مرکزی مجلس شوریٰ کا انتخاب عمل میں آیا تو اس کے لئے جو اراکین کُل پاکستان اساس پر منتخب ہوئے ان میں وہ بھی شامل تھے) اور اس سے ان میں اتنی مایوسی اور بد دلی پیدا ہوئی کہ انہوں نے فوراً جماعت سے علیحدگی اختیار کرنے کا حتمی فیصلہ کر لیا ـــــ چنانچہ وہ اجلاس سے "واک آؤٹ" کر کے سیدھے لاہور آئے اور اپنا استعفا از رکنیت جماعت تحریر کر دیا۔ اس لیے کہ تحریک اسلامی کے قائد اور امیر کے حقوق و اختیارات کے ضمن میں اُن کے تصوّرات مولانا مودودی کے تصوّرات سے مختلف ہی نہیں، بالکل برعکس ہیں! رہا یہ سوال کہ فلسفۂ تنظیم و تحریک کے ضمن میں اتنے متضاد نظریات کے حامل ہونے کے باوجود مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی سترہ برس تک ایک جماعتی نظم میں کیسے منسلک رہے تو اس کا مفصل جواب بھی "نقضِ غزل" ہی سے مل سکے گا۔

بہرحال ان جملہ امور کی وضاحت اب ان شاء اللہ جلد منظرِ عام پر آجائے گی۔ سردست ہم معاصر 'آئین' کے شکریے کے ساتھ مولانا مودودی مرحوم کی یہ تحریر شائع کر رہے ہیں ـــــ خاکسار اسرار احمد]

معزز قارئین!

جنوری ۱۹۹۰ء کے شمارے کی ترسیل اِن شاء اللہ بذریعہ کمپیوٹر ہوگی۔ اس نئے تجربے کے دوران ایڈریس وغیرہ میں غلطی کا احتمال رہے گا۔ لہٰذا پرچہ نہ ملنے کی صورت میں اپنا مکمل پتہ فوراً ہمیں تحریر فرمائیں تاکہ ممکنہ غلطی کو درست کر لیا جائے۔

(نوٹ) آئندہ حوالہ کے لیے تمام قارئین اپنا نیا خریداری نمبر جو لفافے پر درج ہو گا، نوٹ کر لیں۔

آپ کا تعاون ہمارے لیے باعثِ تشکر و امتنان ہوگا۔ (مینیجر سرکولیشن)

خطاب مولانا مودودی مرحوم

"محترم رفقاء

میں نے اپنے ایک سے زیادہ بیانات میں آپ سے وعدہ کیا ہے کہ اس اجتماع کے موقع پر میں آپ کو یہ بتاؤں گا کہ میں جماعت کی امارت سے کیوں الگ ہونا چاہتا ہوں، اس منصب سے میری علیحدگی کیوں ضروری ہوگئی ہے اور میرے خیال میں اب اس تحریک اور جماعت کے نظام کو چلانے کے لیے مناسب صورت کیا ہے۔

مجھے یہ معاملہ آپ کے سامنے ایک بڑے نازک موقع پر پیش کرنا پڑ رہا ہے۔ ایک طرف میرا یہ فرض ہے کہ معاملے کا ہر پہلو آپ کے سامنے بے کم و کاست پیش کر دوں، کیونکہ اس کے بغیر آپ کوئی رائے قائم نہیں کر سکتے۔ مگر دوسری طرف مجھ پر یہ ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے کہ اسے پیش کرنے میں ہر ایسے طریقے سے اجتناب کروں جو کسی خرابی کا موجب ہو، تاکہ آپ اس پر ایک تصفیہ طلب مقدمے کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک حل طلب مسئلے کی حیثیت سے بے لاگ طور پر غور کر سکیں۔ میں اپنے بیان میں ان دونوں باتوں کو ملحوظ رکھنے کی پوری کوشش کرونگا مگر اس میں میری کامیابی ایک حد تک آپ حضرات کی مدد پر بھی منحصر ہے۔ آپ میری مدد اس طرح کر سکتے ہیں کہ جن امور کو میں آپ کے سامنے اجمال کے ساتھ پیش کروں آپ ان کی تفصیل نہ مجھ سے دریافت کریں اور نہ خود ان کی کھوج میں لگ جائیں۔ میں ان کو صرف اس لیے پیش کر رہا ہوں کہ آپ پوری طرح اس صورتِ حال سے باخبر ہو جائیں جو مجھے اور جماعت کو اس وقت درپیش ہے، اور اس غرض کے لیے ان کا صرف اجمالی بیان کافی ہے بشرطیکہ آپ مجھ پر یہ اعتماد کریں کہ میں آپ کے سامنے حقیقی صورتِ حال رکھ رہا ہوں۔ یہ احتیاط آپ ملحوظ نہ رکھیں گے تو ہر چیز کی تفصیل ایک مقدمہ بن جائے گی اور آپ اپنے نصب العین کے لیے آگے کچھ کام کرنے کے بجائے انہی مقدمات میں الجھ کر رہ جائیں گے۔

اب میں آپ کے سامنے اصل معاملہ پیش کرتا ہوں۔

آپ جانتے ہیں کہ جماعتِ اسلامی، جس میں آپ شامل ہوتے ہیں، صرف ایک جماعت

یا انجمن نہیں ہے، بلکہ ایک تحریک کی علمبردار جماعت ہے۔ یہ بھی آپ جانتے ہیں کہ یہ جماعت جس تحریک کی علمبردار ہے وہ کوئی محدود نوعیت کی تحریک نہیں، بلکہ پورے نظامِ زندگی میں ہمہ گیر تغیّر و انقلاب اور اصلاح و تعمیر کی تحریک ہے۔ اس بات سے بھی آپ واقف ہیں کہ یہ تحریک کامیابی کی منزل پر پہنچ نہیں چکی ہے بلکہ جدوجہد اور کشمکش کے کٹھن مراحل سے گزر رہی ہے اور ابھی نہ معلوم کتنی مدّت تک اسے انہی مراحل سے گزرنا ہے۔ یہ بھی آپ کو معلوم ہے کہ اس جدوجہد کا کوئی ایک محاذ نہیں بلکہ بیسیوں محاذ ہیں، اور یہ کشمکش کسی ایک طاقت سے نہیں بلکہ ان بے شمار اندرونی اور بیرونی طاقتوں سے ہے جو اسلامی نظامِ زندگی کے قیام میں شعوری یا غیر شعوری طور پر مزاحم ہیں۔ یہ سب حقیقتیں اگر آپ کے ذہن میں تازہ نہیں ہیں تو براہِ کرم اب تازہ کر لیجیے، کیونکہ اس کے بغیر آپ اس مسئلے کی نزاکت پوری طرح محسوس نہیں کر سکتے جسے میں آپ کے سامنے لانا چاہتا ہوں۔

جو جماعت اس طرح کی ایک تحریک چلا رہی ہو، اس میں قیادت کا مقام اگر کسی ایک شخص کو دیا جائے تو اسے بیک وقت دو مختلف نوعیت کے کام کرنے پڑتے ہیں۔ ایک تحریک کی رہنمائی۔ دوسرے نظامِ جماعت کی سربراہی۔ یہ دونوں کام صرف نوعیت ہی میں ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہیں بلکہ ان کے تقاضے بسا اوقات ایک دوسرے کی ضد ہو جاتے ہیں، اور ایک شخص کے لیے ہر حالت میں ان دونوں کو ایک ساتھ پورا کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ آپ ذرا تجزیہ کر کے دیکھیں تو دونوں کا فرق، اور ان کو ایک ساتھ نباہنے کی دشواری آپ کے سامنے واضح ہو جائے۔

نظامِ جماعت کو چلانا ایک انتظامی نوعیت کا کام ہے۔ وہ لامحالہ ایک دستور چاہتا ہے خواہ وہ تحریری دستور ہو یا رواجی۔ اس کے سربراہ کی حیثیت ایک صدرِ انجمن، ایک ناظم، یا ایک ایگزیکٹو آفیسر سے مختلف نہیں ہو سکتی۔ اس کو لازماً کچھ مقرر اختیارات دیے جائیں گے اور کچھ حدود کا پابند کیا جائے گا۔ وہ ان حدود اور اختیارات سے تجاوز بھی نہیں کر سکتا، اور ساتھ ہی اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اگر اسے انتظام چلانا ہے تو ان حدود کے اندر کسی نہ کسی وقت اپنے اختیارات کو استعمال بھی کرے، خواہ کسی کو گوارا ہو یا ناگوار۔ انتظام کے معاملے میں محبّت

کا کوئی سوال نہیں۔ وہ تو نظم کے تقاضے پورے کرنے کا طالب ہے۔ پھر جماعت کا نظام یہ چاہتا ہے کہ اس کے سب کام ایک لگے بندھے ضابطے پر چلیں۔ اس میں مشورے، اور معاملات کے فیصلے کا ایک طریقہ مقرر ہو۔ اس میں نیچے سے اوپر تک تمام متعلقہ اداروں اور ان سے تعلق رکھنے والے اشخاص کے حدود اور حقوق اور اختیارات معین ہوں۔ اور اس میں ناظم اعلیٰ سے لے کر ایک ابتدائی رکن یا کارکن تک کسی کو نہ اپنی حد سے نکلنے کا حق ہو نہ دوسرے کی حد میں داخل ہونے کا۔ اس میں ہر فیصلے کے متعلق یہ سوال اُٹھایا جاسکتا ہے کہ وہ ضابطہ کے مطابق ہوا ہے یا نہیں۔ اس میں ہر حکم کے متعلق یہ بحث پیدا ہو سکتی ہے کہ وہ قاعدے کے اندر ہے یا باہر۔ اس میں پیدا ہونے والی نزاعات نہ صرف جماعت کے اندر تصفیہ طلب ہو سکتی ہیں، بلکہ ملکی عدالتوں میں بھی جاسکتی ہیں اور پبلک میں بھی بحث کا موضوع بن سکتی ہیں۔ یہ سب کچھ ایک منظم ادارے کی شکل میں کام کرنے کے قدرتی لوازم ہیں۔

علاوہ بریں اگر ایسے کسی ادارے کو جمہوری طرز پر چلنا ہو تو اس میں اختلافات کا دروازہ کھلا ہونا چاہیے۔ فروعی ہی نہیں اصولی اختلاف کی بھی گنجائش ہونی چاہیئے۔ اظہار رائے ہی کی نہیں، اپنے نقطۂ نظر کے حق میں دوسروں کی رائے ہموار کرنے کی بھی آزادی ہونی چاہیئے۔ اس میں پارٹیاں اور گروپ بننا جمہوریت کا فطری تقاضا ہے۔ اس میں اپوزیشن بھی ہو سکتی ہے اور سربراہ کی اپنی پارٹی بھی۔ نظم و نسق اکثریت کے ہاتھ میں بھی رہ سکتا ہے اور مخلوط بھی ہو سکتا ہے۔ فیصلے تقسیم آرا سے بھی ہو سکتے ہیں، اور مختلف گروپوں کی مصالحت سے بھی۔ ادارے کے سربراہ کا کام بہرحال اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ جمہوری فیصلوں کو نافذ کرے۔ جمہوریت خود یہ چاہتی ہے کہ اس میں کسی کا بھی اتنا زور نہ ہو کہ وہ ایک جمہوری ادارے کو اپنی رائے کے مطابق چلائے۔ جو شخص بھی ایسا زور آور بنتا نظر آرہا ہو، جمہوری مزاج خود بخود اس کا زور توڑنے پر مائل ہو جائے گا۔

ایک تحریک کا مزاج، خصوصاً جبکہ وہ کشمکش اور جدوجہد کے مراحل میں ہو، اس سے بالکل مختلف ہے اور اس کو چلانے کے تقضیات کچھ دوسرے ہیں۔ تحریکیں دستوروں پر نہیں چلا کرتیں۔ ضابطوں کی بندش میں نہیں جکڑی جاسکتیں۔ اختلافات، خصوصیت کے ساتھ اصولی اور نظریاتی

اختلافات، ان کے لیے سمِ قاتل ہیں۔ اندرونی پارٹیوں اور گروپوں کا ظہور ان کے لیے پیغامِ موت ہے۔ ان کے اندر نزاعات کا پیدا ہونا ہی خطرناک ہے، کجا کہ کوئی نزاع ایک مقدمے کی صورت اختیار کرے اور تحریک کے چلانے والے اس میں ایک دوسرے کے مقابل فریق ہوں۔ تحریک کا مزاج وحدتِ فکر، وحدتِ قلب و روح، اور زیادہ سے زیادہ وحدتِ عمل چاہتا ہے۔ اس سے تعلق رکھنے والوں کے دلوں اور دماغوں اور طبیعتوں میں جتنی ہم آہنگی اور سعی و حرکت میں جتنی مطابقت ہو، اتنی ہی وہ طاقت ور ہے، اور جتنا ان کے درمیان فرق ہو اتنی ہی وہ کمزور ہے۔ ایک تحریک کی ہوا اکھاڑ دینے کے لیے یہ بات کافی ہے کہ اس کے دو ترجمان دو مختلف زبانوں سے بولنا شروع کر دیں، یا ایک فکر پر چلتے چلتے یکایک اس میں دوسری فکر یا بہت سے مخلوط افکار کا رنگ جھلکنے لگے۔ تحریکوں میں اکثریت و اقلیت کا سوال پیدا ہونا سرے سے غلط ہے۔ جس تحریک میں یہ قاعدہ چلنے لگے کہ فیصلے اکثریت سے ہوں گے، یا اقلیت و اکثریت کے درمیان سمجھوتے سے مخلوط پالیسیاں بنائی جائیں گی، اسے کوئی چیز شکست اور ناکامی سے نہیں بچا سکتی۔ کامیابی کا امکان اگر ہے تو اسی تحریک کے لیے ہے جس کا ہر قدم پوری جماعت کے قلبی فیصلے سے اُٹھے، جس کے ہر فیصلے کو پوری جماعت ہی نہیں، اس کی فکر سے متاثر ہونے والا وسیع ترین حلقہ بھی یوں محسوس کرے کہ گویا یہ اس کے دل کی آواز اور اس کی روح کی مانگ ہے، اور جس سے تعلق رکھنے والوں کو دنیا ہر جگہ ہم رنگ، ہم زبان اور ہم مزاج پائے۔

یہ تو ہے ایک تحریک اور ایک جمہوری ادارے کے فرق کا ایک پہلو۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ ایک تحریک کو چلانے والے رہنما کی حیثیت، اور اس کے کام کی نوعیت، ایک جمہوری ادارے کے سربراہ سے بنیادی طور پر مختلف ہوتی ہے۔ تحریک کی فطرت ایک ایگزیکٹو آفیسر نہیں چاہتی جو تحریک سے تعلق رکھنے والوں، یا ان کے نمائندوں کے فیصلے نافذ کیا کرے، بلکہ وہ ایک ایسا رہنما چاہتی ہے جو اس کی فکر کا ترجمان اور اس کے مزاج کا نمائندہ ہو، جسے تحریک کے اندر بھی اور باہر ساری دنیا میں بھی اس کا ترجمان اور نمائندہ مانا جاتا ہے، جس کو یہ حیثیت حاصل ہو کہ پورے اعتماد کے ساتھ اپنی تحریک کی طرف سے بولے اور پوری تحریک اس کی آواز میں آواز ملا دے۔ اس کی جماعت میں اس کا زور کسی ضابطے اور نظام کے بل پر نہیں بلکہ اس کی فکری قیادت اور اس کے

اخلاقی اثر کے بل پر ہونا چاہیے۔ اس کے ساتھ جماعت کے لوگوں کا تعلق کسی دباؤ سے نہیں بلکہ گہری محبت اور قلبی لگاؤ پر مبنی ہونا چاہیے۔ اس کے ماتحت جماعت کا ڈسپلن امارت کی دھونس سے نہیں بلکہ دل کی سمع وطاعت سے قائم ہونا چاہیے۔ پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جس شخص کو جدوجہد اور کشمکش کے دور میں کسی تحریک کی رہنمائی کرنی ہو وہ کبھی ان جمہوری طریقوں سے کام نہیں چلا سکتا جو صرف انتظامی اداروں کی سربراہی کے لیے موزوں ہوتے ہیں۔ اس کے کام کی نوعیت اس کمانڈر کے کام سے ملتی جلتی ہوتی ہے جو میدانِ جنگ میں فوج کی قیادت کر رہا ہو۔ وہ دیے ہوئے نقشوں پر فوج کو نہیں لڑا سکتا۔ اپنے نقشے اسے خود سوچنے اور بنانے پڑتے ہیں۔ وہ ہر وقت کونسلیں بلا کر اور ان سے پوچھ پوچھ کر کام نہیں کر سکتا۔ اس کو بسا اوقات فیصلہ کرنے کے لیے گھنٹوں اور منٹوں کی مہلت بھی نہیں ملتی۔ وہ مشورے لے بھی سکتا ہے اور اسے مشورے دیئے بھی جا سکتے ہیں، لیکن اگر تحریک اس کو چلانی ہے تو فیصلہ مشیروں کے ہاتھ میں نہیں، اس کے ہاتھ میں ہونا چاہیے۔ اگر پہل (INITIATIVE) اس کے اختیار میں نہ ہو تو وہ کمانڈر نہیں سپاہی ہے۔ اس کو فوج پر یہ اعتماد ہونا چاہیے کہ وہ اس کی اطاعت کرے گی اور فوج کو اس پر یہ اعتماد ہونا چاہیے کہ وہ بروقت اور صحیح فیصلہ کرے گا۔ اس کے اور فوج کے درمیان مشیر حائل نہیں ہو سکتے۔ مشترکہ کمانڈ کا حشر میدانِ جنگ میں وہ ہوا کرتا ہے جو سا جھے کی ہنڈیا کا حشر چوراہے میں ہوتا ہے۔ اسی طرح اس کے اور فوج کے درمیان لگے بندھے قاعدے اور ضابطے بھی حائل نہیں ہو سکتے۔ اسے یہ بھروسہ ہونا چاہیے کہ جس وقت جس کو بھی وہ پیچھے ہٹنے کو کہے گا وہ ہٹ جائے گا اور جسے آگے بڑھنے کا حکم دے گا وہ بڑھ جائے گا۔ حالتِ جنگ میں اسے احکام کی وجہ بتانے پر بھی مجبور نہ ہونا چاہیے، کجا کہ اس کو ان کی جواب دہی کرنی پڑ جائے اور جنگ چھوڑ کر وہ ساری فوج مقدمہ بازی میں لگ جائے۔ فوج اگر چاہے تو کمانڈر بدل سکتی ہے، لیکن اگر اسے لڑنا اور اپنے مقصود کو پہنچنا ہے تو جسے بھی وہ کمانڈر بنائے اس کو یہی اختیارات دینے ہوں گے، ورنہ بہتر ہے کہ وہ لڑائی کا خیال چھوڑ دے۔ اس فوج کو شکست ہی کے لیے نہیں، تباہی کے لیے بھی تیار ہو جانا چاہیے جو عین حالتِ مقابلہ میں اپنی مخالف طاقتوں کو خبر دے کہ اس کا کمانڈر، کمانڈر نہیں بلکہ جنرل اسٹاف کا محض ایجنٹ ہے، اور جنرل اسٹاف ایک مجلسِ مباحثہ (DEBATING SOCIETY) ہے جس میں فوجی افسر تدابیرِ جنگ

سے گزر کر خود مقصد جنگ ہی پر دس دس پندرہ پندرہ دن مناظرہ کرتے رہتے ہیں، اور ہائی کمانڈ کے فیصلے اب فوجی افسروں کی اکثریت کے ووٹ، یا ان کے گروپوں کی مفاہمت پر موقوف ہو کر رہ گئے ہیں۔

تحریک کی قیادت اور جمہوری اداروں کی سربراہی میں ایک اور پہلو سے بھی فرق اور عظیم فرق ہے۔ جیسا کہ میں پہلے اشارہ کر چکا ہوں، جمہوریت یہ نہیں چاہتی کہ اس میں کوئی بھی اتنا زور آور ہو جائے کہ اس کی رائے جمہور کی رائے کے تابع ہونے کے بجائے اس کی حاکم بن جائے۔ ایسا زور جہاں بھی پیدا ہونے لگے گا جمہوری مزاج اس کو ضرور توڑنا چاہے گا۔ ایک انگریز نے اپنی جمہوریت پسند قوم کے ذہن کی خوب ترجمانی کی ہے کہ "ہم ہیروز کی پرستش تو کرتے ہیں مگر کسی ہیرو کی حکومت قبول نہیں کر سکتے"۔ یہ ہے جمہوریت کا مزاج۔ لیکن تحریک کے مزاج کا تقاضا اس کے بالکل برعکس ہے۔ کوئی تحریک اس کے بغیر نہیں چل سکتی کہ اس کو ایک شخصیت لے کر چلے جسے تحریک کے اندر بھی دلوں اور دماغوں پر غیر معمولی اثر حاصل ہو، اور تحریک کے گرد و پیش عام پبلک میں بھی اس کے اثرات پھیلتے چلے جائیں۔ دینی تحریک ہو یا دنیوی، ایک شخصیت کے بغیر اس کا کام نہیں چلتا۔ اللہ تعالیٰ نے خود اسلامی تحریک کے لیے انبیاءؑ کی شخصیتیں سامنے لا کر رکھ دیں اور ان کا غیر معمولی وزن اپنی مشیت ہی سے نہیں، اپنے احکام سے بھی قائم کیا۔ انبیاء کے بعد جب اور جہاں بھی کوئی دینی تحریک اُٹھی ہے ایک شخصیت کے بل پر اٹھی ہے، اور بڑی بڑی شخصیتوں نے کسی دنیوی غرض کے لیے نہیں بلکہ خدا کے دین کی خاطر یہ ایثار کیا ہے کہ اپنا سارا وزن اس کے وزن میں شامل کر کے اس کا وزن بڑھایا اور گرد و پیش کی دنیا میں اس کا اثر قائم کیا۔ پچھلی ہی صدی میں خود ہمارا ملک ایک عظیم الشان تحریک جہاد کا نظارہ کر چکا ہے۔ اس نے جو کارنامہ انجام دیا اور جس وسیع پیمانے پر لاکھوں انسانوں کو متاثر کیا وہ اس کے کارکنوں کی خوبی سے زیادہ ایک شخصیت کے جادو کا اثر تھا اور اس جادو کو فروغ دینے میں شاہ اسماعیل شہید اور مولانا عبدالحئی اور بہت سی دوسری عظیم شخصیتوں نے حصہ لیا تھا۔ اسی صدی میں دو خالص دنیوی تحریکیں ہمارے برعظیم میں چل چکی ہیں۔ ایک نے برطانوی حکومت کا تختہ اُلٹ کر ہندوستان کو آزاد کرایا اور دوسری نے ہندوؤں کے حلق سے پاکستان اگلوا لیا۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ یہ جو کچھ بھی کامیابی ان دونوں تحریکوں کو نصیب ہوئی، ایک ایک شخصیت کے بل پر ہی ہوئی ہے

اور یہ دیکھ لیجئے کہ وقت کے کیسے کیسے بڑے لوگوں نے اپنی شخصیتوں کو ان دونوں لیڈروں کی شخصیتوں میں گم کر دیا تھا۔ یہ تحریکوں کا فطری مزاج ہے۔ کسی کو دین عزیز ہو یا وطن عزیز ہو، یا قوم عزیز، بہر حال جس کو بھی کسی مقصد عزیز کے لیے کوئی تحریک چلانی ہو اسے دل کی آمادگی کے ساتھ، یا سینے پر پتھر رکھ کر، ایک شخصیت گوارا کرنی پڑے گی، بلکہ خود بنانی اور دوسروں سے بنوانی پڑے گی۔ جمہوریت اس سے انکار کرتی ہے اور تحریک اس کا تقاضا کرتی ہے۔

میں نے تفصیل کے ساتھ یہ تجزیہ آپ کے سامنے اس لیے کیا ہے کہ آپ اس اجتماعِ ضدین کو اچھی طرح سمجھ لیں جس پر جماعتِ اسلامی نے اپنے نظام کا ڈھانچہ اور اپنے کام کا نقشہ مرتب کیا ہے، اور ان مشکلات کو بھی سمجھ لیں جو آپ کی جماعت کے امیر کو دو بالکل مختلف اور متضاد حیثیتیں نباہنے میں لازماً پیش آتی ہیں۔ آپ ایک طرف تو ایک جمہوری جماعت ہیں جس کا سارا کام ایک لگے بندھے ضابطے اور ایک مقرر دستور پر چلتا ہے۔ اور دوسری طرف آپ ایک تحریک لے کر چلتے ہیں جو بہت سی مزاحم طاقتوں کے مقابلے میں ایک ہمہ گیر اصلاح و انقلاب کے لیے برسرِ پیکار ہے۔ ان دونوں کاموں کی سربراہی آپ ایک آدمی کے سپرد کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ جمہوری ادارے کے ناظم کی حیثیت سے وہ جمہوریت کے سارے تقاضے بھی پورے کرے، اور تحریک کے رہنما کی حیثیت سے ان تقاضوں سے بھی عہدہ برآ ہو جو جمہوری تقاضوں کی عین ضد ہیں۔ آپ کی جماعت جس روز سے بنی ہے میں آج تک ان دونوں حیثیتوں کو بھلی طرح یا بُری طرح، بہر حال کسی نہ کسی طرح نباہتا رہا ہوں، اور اس پر کسی داد کا نہ طالب ہوں نہ مستحق۔ جب تک میرے لیے کام کرنے کی کچھ بھی گنجائش رہی، میں نے خدمت سے منہ نہیں موڑا اور ہر طرح کے دردِ سر برداشت کیے۔ لیکن اب میرے لیے اس اجتماعِ ضدین کو نباہنا قریب قریب ناممکن ہو چکا ہے۔ میں کسی نظریے اور قیاس کی بنا پر نہیں بلکہ مسلسل تجربات کی بنا پر پوری طرح غور و خوض کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ جماعتِ اسلامی میں جمہوریت اور تحریکیت کا تضاد، اور جماعت کی امارت میں نظم کی سربراہی اور تحریک کی رہنمائی کا تضاد، جو اب تک کسی نہ کسی طرح ایک مزاج میں سمویا جاتا رہا ہے، اب اس حد کو پہنچ گیا ہے کہ اگر حکمت اور معاملہ فہمی کے ساتھ اس کا علاج بروقت نہ کیا گیا تو یہ جماعت اور تحریک دونوں کو لے ڈوبے گا۔ اس معاملے میں میری ذمہ داری دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، آپ سب لوگوں سے

زیادہ سخت اور نازک ہے۔ میں بیس پچیس سال سے اس تحریک کو چلاتا آرہا ہوں۔ اور پندرہ سال سے جماعت کی سربراہی کا بار بھی میرے اُوپر رہا ہے، حتیٰ کہ قید کے زمانے میں بھی اس بار سے میں پوری طرح سبکدوش نہیں ہو سکا ہوں۔ میرے لیے یہ برداشت کرنا ممکن نہیں ہے کہ خدا کے دین کی خاطر، اس کے بہت سے مخلص بندوں نے جس چیز کی تعمیر کا سربراہ کار مجھے بنایا تھا، اب میری ہی سربراہی میں اس کی تخریب ہو۔ میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اوّلین فرصت میں تمام رفقائے جماعت کے سامنے وہ وجوہ بھی رکھ دوں جن کی بنا پر منصب امارت کی دوگونہ اور متضاد ذمہ داریاں میرے سپرد رہنا اس کام کے لیے تباہ کن ہے، اور یہ بھی بتا دوں کہ میرے نزدیک اب اس تضاد کے نقصانات سے جماعت اور تحریک کو بچانے کی کیا صورتیں ممکن ہیں۔

جماعت میں جمہوری میلانات اب اس رُخ پر چل پڑے ہیں کہ جدوجہد ہی کے مرحلے میں اس کے اندر مختلف الخیال افراد کی گروہ بندی شروع ہو گئی ہے۔ جمہوری نقطۂ نظر سے یہ چیز کسی طرح بھی قابلِ اعتراض نہیں، بلکہ عین تقاضائے جمہوریت ہے۔ آخر چند افراد، جو ایک خیال رکھتے ہوں، کیوں نہ ایک دوسرے سے ربط قائم کریں؟ کیوں نہ تحریر و تقریر اور بحث و گفتگو کے ذریعہ سے اپنے خیالات کی تبلیغ کریں؟ کیوں نہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنا ہم خیال بنائیں؟ کیوں نہ جماعت کے عام ارکان اور با اثر لوگوں کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کریں؟ کیوں نہ باہمی تعاون کے ساتھ جماعتی مشوروں پر اپنا اثر ڈالیں؟ ان میں سے کوئی چیز بھی نہ جمہوریت کے خلاف ہے، نہ اسے ناجائز ہی کہا جا سکتا ہے۔ لیکن جدوجہد کے مرحلے میں کسی تحریک کی علمبردار جماعت کے اندر جمہوریت کا یہ تجربہ سخت نقصان دہ، بلکہ مہلک ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ایک گروہ کے مقابلہ میں دوسرے گروہ بھی منظم ہوں، جماعت کے اندر گروہوں کی کشمکش برپا ہو، امیر جماعت پوری تحریک اور جماعت کا لیڈر نہ رہے بلکہ عملاً جماعت کے اندر اکثریت کا لیڈر بن کر رہ جائے، ایک جگہ اس کی ہدایات پر عمل ہو تو دوسری جگہ ان پر تنقید ہو رہی ہو اور ان کی تعمیل میں کم از کم سرد مہری برتی جائے، جماعت کے عام کارکنوں میں تذبذب، بے اطمینانی اور دودلی کی کیفیت پیدا ہو جائے، عوام النّاس کے سامنے جماعت کے لوگ خود اپنے ان اختلافات کو پیش کر کے اپنی تحریک کی ہوا اکھاڑ دیں، امیر جماعت اس حالت کو فروغ پانے دے تو ایک ایسے کام کی بربادی کا مظلمہ اپنی گردن پر لے جو بیس پچیس سال

کی مسلسل کوششوں سے اس ملک میں خدا کے دین کے لیے اس درجے کو پہنچا ہے کہ اب نہ صرف یہاں، بلکہ بیرونی دنیا میں بھی اسلام پسند لوگوں کی امیدیں اس کی کامیابی سے وابستہ ہو رہی ہیں اور اگر وہ اسے روکنے کی کوشش کرے تو اس پر آمریت اور استبداد کے الزامات عائد ہوں جماعت کے اندر اس کے اپنے دست و بازو اس کے خلاف خم ٹھونک کر کھڑے ہو جائیں، جماعت کے باہر علی الاعلان اس کے خلاف پروپیگنڈہ شروع ہو جائے، اچھے اچھے ذمہ دار لوگ جماعت سے نکلنے پر تیار ہو جائیں، اور مخالف طاقتیں اس پھوٹ کو دیکھ کر جماعت کے ان عناصر کی پیٹھ ٹھونکنے لگیں جن کے طرزِ فکر کو وہ اپنے مفاد کے لیے زیادہ مفید سمجھیں۔ جدوجہد کے دور میں جمہوریت کا یہ تجربہ ان نتائج کے سوا کوئی دوسرا نتیجہ پیدا نہیں کر سکتا، اور بدقسمتی سے یہ نتائج رونما ہونے شروع ہو گئے ہیں۔

میں نے خوب غور کر کے یہ رائے قائم کی ہے، اور آپ حضرات بھی جذبات سے قطع نظر کر کے غور کریں گے تو اسی رائے پر پہنچیں گے کہ اس حالت میں میرا امیر جماعت رہنا جماعت اور تحریک کے لیے بہت خطرناک ہے۔ آپ سب جانتے ہیں کہ ابتدا سے اس تحریک اور اس جماعت کے ساتھ میرے تعلق کی نوعیت کیا رہی ہے، اور جماعت کے اندر ہی نہیں، باہر سارے ملک میں، اور ملک سے بھی باہر دنیا میں مجھ کو کیا حیثیت دی جاتی رہی ہے۔ یہ حیثیت بجا ہے یا بیجا، اس سے یہاں بحث نہیں ہے۔ بہرحال یہ ایک امرِ واقعہ ہے، اور اس کی موجودگی میں یہ بات آپ کے لیے غور طلب ہے کہ اگر میری یہ حیثیت مجروح ہو جائے تو اس سے جماعت کی ساکھ اور اس تحریک کے نفوذ و اثر کو جو نقصان پہنچے گا اس کی تلافی آپ اور کس طرح کر سکیں گے۔ میں امیر جماعت نہ رہوں اور میرے پاس میرے اخلاقی اثر اور میری دلیل کی طاقت کے سوا کوئی دوسری طاقت نہ ہو، تو میں بتدریج جماعت کو سمجھا کر جمہوریت کے اس قبل از وقت تجربے سے باز رکھ سکتا ہوں لیکن نظامِ جماعت کا سربراہ بھی اگر اس وقت میں ہی رہوں تو اس حالت کی اصلاح کے لیے جو کوشش بھی کروں گا وہ محض ایک اخلاقی سعی نہ ہو گی بلکہ اس کے ساتھ نظم و ضبط کی طاقت بھی ہو گی۔ اس صورت میں لاکھ جتن بھی کروں تو میں نہ ایک فریق بننے سے بچ سکتا ہوں اور نہ اس شبہ ہی سے محفوظ رہ سکتا ہوں کہ اس ناوقت جمہوریت سے جماعت کو بچانے کے لیے میری کوشش اس دینی تحریک کے مفاد کے لیے نہیں بلکہ اپنی آمریت برقرار رکھنے کے لیے ہے۔ میں پچیس سال تک اس تحریک کی خدمت

کرنے سے میری جو کچھ بھی حیثیت بن گئی ہے وہ اسی صورت میں مفید ہو سکتی ہے جبکہ جماعت اور اس کے حلقۂ اثر کے ہر شخص کو مجھ پر اعتماد ہو، اور ہر ایک کے ساتھ میرا تعلق یکساں محبت و اخلاص کا ہو، اور میرا اخلاقی اثر ان لوگوں پر بھی باقی رہے جو میری رائے سے اختلاف رکھتے ہوں۔ ایک فریق بن جانے اور طرح طرح کے شبہات و الزامات سے متہم ہو جانے کے بعد مجھے یہ چیز حاصل نہ رہے گی، اور اس کا نقصان اس سے بہت زیادہ ہو گا جو بظاہر آپ میرے امارت سے ہٹ جانے میں محسوس کرتے ہیں۔

ایک اور وجہ جو اس سے بھی زیادہ اہم، بلکہ میرے نزدیک سب سے زیادہ اہم ہے وہ یہ ہے کہ میری جو کچھ بھی شخصیت دین کی تھوڑی سی خدمت کرنے کی وجہ سے بن گئی ہے وہ اب دین کے کام آنے کے بجائے دین کی راہ میں حائل ہوتی نظر آ رہی ہے۔ بہت سی باتیں جو پہلے جماعت کے حلقوں سے باہر، زیادہ تر مخالفین کی زبانوں سے سنی جاتی تھیں، اور خلافِ واقعہ بدگمانی سمجھ کر نظر انداز کر دی جاتی تھیں، اب وہ خود جماعت میں اچھے اچھے ذمہ دار لوگوں کی زبان و قلم پر آنے لگی ہیں، اور یہ ممکن نہیں رہا ہے کہ ان کو بھی نظر انداز کیا جائے۔ جو خیالات ظاہر کیے گئے ہیں، اور جن کو میں یقینی ذرائع سے جانتا ہوں وہ یہ ہیں کہ میری وجہ سے جماعتِ اسلامی میں شخصیت پرستی پیدا ہو رہی ہے۔ میری امارت در اصل ایک پیری کی گدی ہے، اور یہ جماعت میرے مریدوں کی جماعت ہے۔ اس جماعت میں میری بات میری دلیل کی طاقت اور میری رہنمائی پر ہوشمندانہ اعتماد کی وجہ سے نہیں چلتی بلکہ میری شخصیت کے ساتھ لوگوں کی اندھی عقیدت کی وجہ سے چلتی ہے۔ اس میں کسی آزاد فکر اور مستقل رائے رکھنے والے آدمی کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے، کیونکہ وہ میرے مقابلے میں اپنی بات نہیں منوا سکتا۔ جماعت میں جو کوئی میری بات کی تائید کرتا ہے اس کی تائید کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ عقل و بصیرت کی بنا پر مجھ سے اتفاق رکھتا ہے، بلکہ در اصل یا تو وہ خوشامدی ہے یا اندھا مرید۔ مجھ سے اختلاف ایک خوبی ہے، کیونکہ وہ اخلاقی جرأت اور استقلال رائے کی علامت ہے، اور میری تائید ایک بُرائی ہے کیونکہ اس کی وجہ خوشامد یا اندھی عقیدت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اس حالت میں ضمیر اور عقل و علم رکھنے والوں کے لیے دو ہی راستے رہ گئے ہیں۔ یا تو وہ جماعت کو چھوڑ کر چلے جائیں، یا پھر جماعت میں رہ کر اس شخصیت کے بُت کو توڑنے کی فکر کریں۔

اپنے بہترین اور عزیز ترین رفقاء کے یہ خیالات جب سے میرے علم میں آئے ہیں، میں اس فکر میں لگ گیا ہوں کہ اس بُت کے توڑنے کا اجر و ثواب ان سے پہلے میں خود لوٹ لے جاؤں۔ خدا کی لعنت اس شخصیت پر جو خدا کی راہ میں کام آنے کے بجائے اس کے راستے میں بُت بن کر کھڑی ہو جائے۔ اس کو توڑنے کے لیے پہلا کام تو میں یہ کرتا ہوں کہ اس پیری کی گدی کو آپ کے سامنے لات مار کر عام ارکان کی صف میں آ رہا ہوں۔ اس سے بھی کام نہ چلے گا تو زبان و قلم پر قفل چڑھا کر کسی گوشے میں بیٹھ جاؤں گا۔ پھر بھی یہ شخصیت راہِ خدا میں حائل رہی تو ملک چھوڑ کر کہیں چلا جاؤں گا۔ میں اس شخصیت کو ختم کرنے کے لیے خودکشی تو نہیں کر سکتا، کیونکہ یہ جائز نہیں ہے، اور یہ بھی نہیں کر سکتا کہ کسی گناہِ کبیرہ کا ارتکاب کر کے اسے ذلیل کروں۔ البتہ دوسری ہر وہ تدبیر اختیار کرنے کے لیے تیار ہوں جس سے شخصیت کا یہ بُت خدا کے راستہ سے ہٹ سکے۔

محترم رفقاء! یہ ہیں وہ وجوہ جنہوں نے مجھے اس بات پر مطمئن کر دیا ہے کہ میرا اب جماعت کی امارت سے ہٹ جانا ضروری ہے، اور اس پر ٹھہرنا نقصان دہ۔ کسی کو یہ غلط فہمی لاحق نہ ہونی چاہیے کہ مجھ سے کوئی قصور ہو گیا ہے جس کی جوابدہی سے میں ڈرتا ہوں۔ اس لیے استعفا دے کر اس پر پردہ ڈال رہا ہوں۔ جو شخص بھی ایسا خیال رکھتا ہو میں اسے قسم دیتا ہوں کہ میری ذاتی زندگی کا جو عیب بھی اسے معلوم ہے، یا میرے زمانہ امارت کے جس کام کو بھی وہ انصاف، یا دیانت، یا دستور جماعت کے خلاف سمجھتا ہے، اسے یہاں پوری جماعت کے سامنے علی الاعلان پیش کر دے۔ میں اس وقت تک یہاں سے نہ ہٹوں گا جب تک اس کی جوابدہی نہ کر لوں۔ اور جماعت کو خدا کا واسطہ دے کر کہوں گا کہ وہ میرے ساتھ کسی رعایت سے کام نہ لے، بلکہ اگر میرے اُوپر کوئی الزام ثابت ہو تو میرا استعفا قبول کرنے کے بجائے عدمِ اعتماد کی تجویز پاس کر کے مجھے معزول کر دے۔

اسی طرح اگر کسی کا یہ خیال ہو کہ میں اپنی کچھ باتیں منوانے کے لیے استعفا کو دھمکی کے طور پر استعمال کر رہا ہوں تو وہ بھی اپنے دل سے یہ خیال نکال دے۔ میں پہلے یہ کہہ چکا ہوں اور پھر اس کا اعادہ کرتا ہوں کہ میں نے یہ استعفا واپس لینے کے لیے نہیں دیا ہے۔ خوب سوچ سمجھ کر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ میرا امیر جماعت رہنا اب اس کام کے لیے مفید نہیں بلکہ اُلٹا نقصان دہ ہے، اور اس رائے کے وجوہ میں نے بے کم و کاست آپ کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ اس پر بھی یہ

بدگمانی باقی رہ جائے کہ جب دلیل نہیں چلتی تو میں استعفے کی دھمکی سے کام نکالتا ہوں، تو میرے پاس اس کا کوئی علاج نہیں۔

اب میں وضاحت کے ساتھ آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میرے نزدیک آئندہ کے لیے کیا انتظام ہوگا۔

سب سے پہلے آپ کو یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ آپ جماعت کی قیادت کے لیے کس طرح کا انتظام پسند کرتے ہیں۔

اس کی ایک شکل یہ ہے کہ آپ امیر جماعت کو صرف نظم جماعت کا سربراہ بنا کر رکھیں اور تحریک کسی ایک شخص کی راہنمائی میں نہ چلے بلکہ عام جمہوری اداروں کی طرح اجتماعی فیصلوں سے چلے، اور امیر جماعت کا کام ان فیصلوں کو نافذ کرنے سے زیادہ کچھ نہ ہو۔ اس طرز پر تحریک چلانے کا تجربہ آپ کرنا چاہیں تو کر لیں۔ آپ جماعت میں درجنوں ایسے آدمی پا سکتے ہیں جو اس حیثیت سے جماعت کے مرکزی صدر کی خدمت انجام دینے کی پوری قابلیت رکھتے ہیں۔ میرے ہٹ جانے سے اس صورت میں سرے سے کوئی خلا واقع نہیں ہوتا۔

دوسری شکل یہ ہے کہ آپ امیر جماعت کو بیک وقت اپنے جمہوری نظام کا سربراہ بھی رکھنا چاہیں اور تحریک کا رہنما بھی۔ یہ اگر آپ کی مرضی ہو تو آپ مجھے چھوڑ کر جماعت کے ذمہ دار بزرگوں میں سے جس کو مناسب سمجھیں اپنا امیر چن لیں۔ میں ہر اس شخص کی اطاعت اور وفادارانہ رفاقت کا عہد کرتا ہوں جسے آپ امیر بنائیں۔ جو خدمت بھی مجھ سے لی جائے گی اس کے بجا لانے میں مجھے ذرہ برابر تامل نہ ہوگا۔ میری شخصیت اگر آپ کے منتخب کردہ امیر کی مددگار بن سکے گی تو یہاں پائی جائے گی، ورنہ اس سے نجات پانے کے لیے آپ کو کسی فکر کی ضرورت نہ پیش آئے گی۔ اس کا استیصال اِن شاء اللہ میں خود کروں گا۔

تیسری شکل یہ ہے کہ آپ نظام جماعت کی امارت اور تحریک اسلامی کی رہنمائی کو ایک دوسرے سے الگ کر دیں۔ اس صورت میں جماعت کا سارا نظم دستور کے مطابق ایک امیر چلاتا رہے گا، اور تحریک بھی اسی جماعتی مشینری کے ذریعہ سے چلے گی، مگر تحریک کی رہنمائی ایک ایسا شخص کرے گا جس کے لیے دستور میں کوئی نام اور کوئی منصب اور کوئی ضابطے کا اختیار و اقتدار نہ ہوگا۔ اس کی جگہ اگر

ہوگی تو آپ کے دستور میں نہیں بلکہ آپ کے دلوں میں ہوگی۔ آپ اسے باقاعدہ منتخب نہ کریں گے بلکہ محض اعتماد کی بنا پر اس کی رہنمائی قبول کریں گے۔ اس کے پاس اپنے فیصلے نافذ کرنے کے لیے کوئی طاقت نہ ہوگی بلکہ آپ کا امیر اور آپ کی مجلس شوریٰ اور آپ سب اپنی مرضی سے خود چاہیں گے تو اس کے مشوروں پر چلیں گے اور اس کی قیادت میں کام کریں گے۔ جب تک آپ چاہیں اس کو رہنما بنا کر رکھیں اور اسے اپنا لیڈر مانتے رہیں۔ یہ بالکل آپ کا اپنا اختیاری فعل ہوگا۔ اور جب کبھی آپ اس سے جان چھڑانا چاہیں تو یہ بات بالکل کافی ہوگی کہ اس کے کہے پر چلنا چھوڑ دیں۔ اس کے لیے سر سے کسی جھگڑے اور کسی ضابطے کی کارروائی کا سوال پیدا ہی نہ ہوگا۔

اس آخری صورت کا تجربہ آپ کرنا چاہیں تو نظم جماعت کے لیے بس ایک امیر چن لیجئے۔ رہا رہنمائے تحریک تو وہ آپ کی رائے عام سے خود اس مقام پر آجائے گا۔ اس معاملہ میں کسی رائے دہی اور کسی انتخاب کی کوئی حاجت نہیں، کیونکہ یہ کوئی دستوری چیز نہیں ہے۔

لیکن ضروری تنبیہ کے طور پر میں دو باتیں پہلے ہی آپ سے عرض کیے دیتا ہوں۔ ایک یہ کہ جماعت کی موجودہ شخصیتوں میں سے جس کسی کو بھی آپ رہنمائی کا مقام دیں وہ اسی صورت میں اس تحریک کی کوئی خدمت انجام دے سکے گا جبکہ باقی تمام شخصیتیں اس کی پیش روی کو خواستہ یا ناخواستہ گوارا کرنے کے لیے تیار ہوں۔ دینی لحاظ سے قطع نظر، دنیوی وجاہت و قابلیت اور ناموری کے لحاظ سے ہمارے درمیان شاید ہی کوئی شخصیت اس پائے کی ہو جس پائے کی شخصیتیں کانگرس میں جمع ہوئی تھیں۔ مگر آپ نے دیکھا کہ ان لوگوں نے خدا کی خاطر نہیں، کسی اجر آخرت کی اُمید پر نہیں، صرف آزادی وطن کی خاطر گاندھی کی شخصیت کا نہ صرف تابع ہونا گوارا کیا بلکہ اس کی بڑائی خود قائم کی۔ اور اس کا نتیجہ آپ سب لوگ دیکھ چکے ہیں۔ ہم بھی اگر دنیا میں خدا کا کلمہ بلند کرنا چاہتے ہیں تو کسی ایک آدمی کو آگے کر کے سب کو اس کے پیچھے چلنا ہوگا، اور خدا ہی کی خاطر اس کی شخصیت میں اپنی شخصیتوں کو گم کر دینا پڑے گا۔ یہ قربانی دینے کے لیے کوئی تیار ہو یا نہ ہو، میں اس کے لیے پتے دل سے تیار ہوں۔ آپ جس کو بھی بالاتفاق اپنا رہنما مان لیں گے، میں خدا کو اور آپ سب کو گواہ کر کے اعلان کرتا ہوں کہ اپنا سب کچھ لا کر اس کے قدموں میں ڈال دوں گا۔

دوسری بات جو یہ کام کرنے سے پہلے آپ کو خوب سمجھ لینی چاہیے وہ یہ ہے کہ کشمکش کے

دور میں ایک تحریک کی رہنمائی کا کام ایک ڈرائیور کے کام سے ملتا جلتا ہوتا ہے جس کے ہاتھ میں آپ موٹر کا اسٹیرنگ وہیل دے رہے ہوں اس کے متعلق اچھی طرح اطمینان کر لیجئے، اور چلنے سے پہلے یہ بھی طے کر لیجئے کہ کہاں جانا ہے اور کس طرف سے جانا ہے۔

مزید جو مشورے یا ہدایات بھی آپ دینا چاہیں آغاز سفر میں دے دیجئے۔ لیکن جب ڈرائیور اسٹیرنگ وہیل سنبھال کر پُر ہجوم راستوں سے گاڑی لیے جا رہا ہو، اس وقت گاڑی میں بیٹھے ہوئے لوگ چاہے بجائے خود کیسے ہی ماہر ڈرائیور ہوں، اور چاہے خود موٹر کے بنانے والے انجنیئر ہی کیوں نہ ہوں، ڈرائیور کو بار بار مشوروں اور ہدایات اور احکام اور نقد و تبصرے سے نواز کر صرف حادثہ ہی مول لے سکتے ہیں، بخیریت منزل پر نہیں پہنچ سکتے۔ اس لیے کہ اس وقت صرف ڈرائیور ہی کی قوت فیصلہ یہ طے کر سکتی ہے کہ کس ہجوم سے گاڑی کو کس طرح نکالے، آتی جاتی گاڑیوں سے اپنی گاڑی کو کیسے بچاتے، کس گاڑی کو آگے نکلنے دے اور کس سے خود آگے نکل جائے، اور ایک طرف سے اگر راستہ بند ہو تو دوسری طرف سے کس طرح اپنا راستہ نکالے۔ ایسے مواقع پر مشورے کی ضرورت ہو گی تو ڈرائیور خود اسے محسوس کر کے مشورہ لے گا، کچھ پوچھنا ہو گا تو وہ خود پوچھے گا، کوئی ہدایت طلب کرنی ہو گی تو وہ خود طلب کر لے گا، دوسروں کے لیے، اگر وہ بخیریت سفر کرنا چاہتے ہوں، اس کے سوا کوئی کام نہیں ہے کہ وہ صبر کے ساتھ چلے چلیں۔ حتیٰ کہ اگر حادثہ بھی ہوتا نظر آئے تو ضبط سے کام لیں، اس لیے کہ خطرے کے موقع پر شور مچانے یا اسٹیرنگ وہیل پر ہاتھ ڈالنے کے معنی یہ ہیں کہ حادثہ نہ ہوتا ہو تو ہو جائے۔ آپ ڈرائیور بدلنا چاہیں تو بدل دیں، مگر جسے بھی ڈرائیور بنائیں اس کو اطمینان کے ساتھ گاڑی چلانے دیجئے۔ جو شخص اسے آمریت سمجھ کر اس پر صبر نہ کر سکتا ہو اس کا گاڑی سے اُتر جانا اس سے بہتر ہے کہ وہ خود بھی حادثے سے دوچار ہو اور پوری موٹر کو بھی اس کے مسافروں سمیت خطرے میں مبتلا کرے۔ تاہم اگر آپ لوگ ایک دفعہ تمام موٹر نشینوں کی مشترک ڈرائیوری کا تجربہ کرنا چاہیں تو میں آپ کو اس سے منع نہیں کرتا۔ میں اس میں بھی آپ کے ساتھ ہوں۔ جو کچھ آپ سب کا حشر ہو گا میرا بھی ہو جائے گا۔ البتہ اس صورت میں اسٹیرنگ وہیل ہاتھ میں لینے کی ذمہ داری آپ مجھ پر ڈالنا چاہیں گے بھی تو میں اسے کبھی قبول نہ کروں گا۔ اس اسکیم میں میری جگہ محض ایک خاموش مسافر کی ہو گی جو گاڑی اور اس کے مسافروں کی سلامتی کے لیے دعا کرنے کے سوا کچھ نہ کر سکے گا۔"

HOUSE OF QUALITY BEARINGS

KHALID TRADERS

IMPORTER, INDENTOR, STOCKIST, SUPPLIER,
OF ALL KINDS OF BALL, ROLLER & TAPER BEARINGS

WE HAVE :
- BEARINGS FOR ALL INDUSTRIES & MARINE ENGINES.
- AUTOMOTIVE BEARINGS FOR CARS & TRUCKS.
- BEARINGS UNIT FOR ALL INDUSTRIAL USES.
- MINIATURE & MICRO BEARINGS FOR ELECTRICAL INSTRUMENTS.

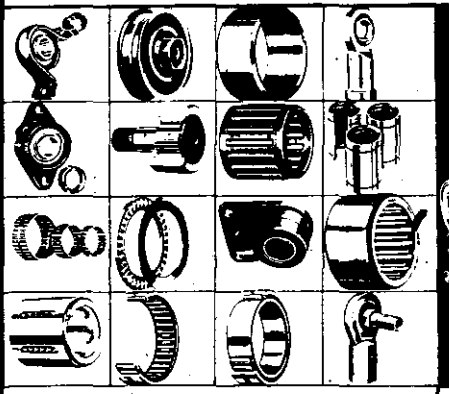

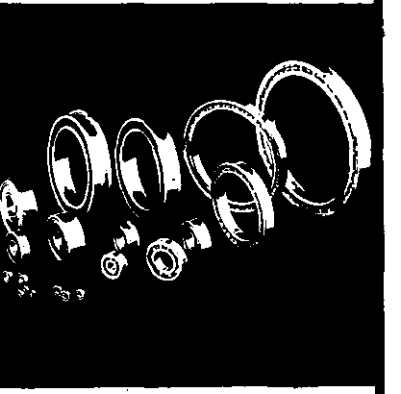

PRODUCTS

HIGH PRECISION

MINIATURE BEARINGS
EXTRA THIN TYPE BEARINGS
FLANGED BEARINGS
BORE DIA .1 mm TO 75 mm

DISTRIBUTOR

RCD KBC

STOCKIST

TR NACHI Koyo NSK SKF NTN

CONTACT : TEL. 732952 - 735883 - 730595
G.P.O BOX NO.1178.OPP KMC WORKSHOP
NISHTER ROAD, KARACHI - PAKISTAN
TELEX: 24824 TARIQPK. CABLE: DIMAND BALL.

تبلیغی جماعت قیام پاکستان کے بعد

(باب دوم)

بسلسلہ تبلیغی جماعت کے ذمہ دار حضرات سے دردمندانہ گزارش (آخری قسط)

از قلم: سید تنظیم حسین

(نوٹ: تبلیغی جماعت سے متعلق کسی بھی قسم کی گفتگو کرتے وقت یہ دشواری ہوتی ہے کہ اس جماعت کی طرف سے کسی قسم کی تحریر نہیں ملتی۔ لہٰذا جو کچھ لکھا گیا ہے وہ مشاہدات اور ذاتی معلومات کی بنیاد پر سپردِ قلم کیا گیا ہے۔)

برصغیر کی تقسیم کے بعد مسلمانوں کا مستقبل

برِصغیر ہندوستان کی تقسیم اور مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ مملکت کا مطالبہ کیوں کیا گیا، تقسیم سے پہلے اور بعد میں مسلمانوں پر کیا گزری، ملک کی تقسیم مسلمانوں کے لئے مفید رہی یا مضر۔ یہ سب باتیں ایسی ہیں کہ ان پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے اور لکھا جارہا ہے۔ ان کا اعادہ غیر ضروری سمجھتے ہوئے ان کی تفصیلات سے صرفِ نظر کیا جاتا ہے۔ واضح حقیقت یہ ہے کہ ملک تقسیم ہوا اور ایک خود مختار، آزاد اسلامی مملکت وجود میں آئی۔ یہ واقعہ غزنوی، غوری اور ابدالی کی فتوحات کے بعد اہم ترین واقعہ ہے۔ اس واقعہ سے ان مسلمانوں کے مستقبل پر بھی اثر پڑا جو بھارت میں رہے۔ اور ان مسلمانوں پر جن کا تعلق ان علاقوں سے رہا ہے جو پاکستان کہلائے اضافی ذمہ داریاں عائد ہو گئیں۔ پہلے بھارت کے مسلمانوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

بھارتی مسلمانوں کا مستقبل اور تبلیغی جماعت

برصغیر کی تقسیم کے بعد بھارتی مسلمانوں کے مستقبل پر شدید اثر پڑا۔ وہ ایسی

بہت سی مراعات سے بھی محروم ہو گئے جو ان کو برطانوی دورِ حکومت میں حاصل تھیں - حسبِ توقّع بھارت کا آئین سیکولر بنا اور اس میں ہر مذہب کے پیروؤں کو مذہبی آزادی دی گئی - لیکن جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے بھارت کی کیفیت دیگر سیکولر ممالک سے مختلف ہے ' کیونکہ بھارت میں مسلمانوں کو ایک ایسی اکثریت کے ساتھ زندگی گزارنا ہے جو ماضی کا انتقام لینے کے لئے کمربستہ ہے اور جس کے عزائم اور رویّہ کی ایک جھلک کانگریسی وزارتوں کے دور میں نظر آچکی تھی - لہٰذا اگرچہ مسلمانوں نے بھارت میں قریب قریب اتنی ہی مذہبی آزادی کی امید رکھی جتنی کہ برطانوی دورِ حکومت میں ان کو حاصل رہی ' لیکن اب ان کو ہندو اکثریت کے مستقل دباؤ کا مقابلہ کرنا تھا ' جس سے زندگی کا کوئی شعبہ مستثنیٰ نہ تھا - گویا ان کے لئے سب سے بڑا مسئلہ بقا کا تھا - یہ صورت حال انگریزی دور حکومت میں نہ تھی - بہر حال اس بدلی ہوئی فضا میں تبلیغی جماعت کی قیادت کو اپنی سرگرمیاں جاری رکھنے میں کسی مشکل کی توقع نہ تھی ' کیونکہ اس کی نوعیت بالکل ابتدائی تھی - نہ ان کا مقصد بھارت میں اسلامی معاشرہ کا قیام تھا اور نہ غلبۂ اسلام - یہی وجہ ہے کہ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد بھارت کے ایک ذمہ دار شخص سے یہ گفتگو منسوب کی جاتی ہے کہ جب اس سے تبلیغی جماعت کے متعلق کہا گیا تو اس نے کہا کہ ہمیں ان سے کوئی خطرہ نہیں - یہ تو دوسری دنیا کی بات کرتے ہیں - یہ بات صحیح ہو یا غلط ' الحمد للہ بھارت میں تبلیغی جماعت اپنے پروگرام پر بڑی خوش اسلوبی سے عمل پیرا ہے - اگرچہ پروگرام ابھی تک محدود ہے ' لیکن بڑے بڑے شہروں میں عظیم الشان اجتماعات کا انعقاد آبِ حیات سے کم نہیں - تبلیغی جماعتوں کا گاؤں گاؤں جانا اور مشقتیں اٹھانا مسلمانوں میں احساسِ زندگی قائم رکھنے کے لئے بہت ہی مفید ہے - مختصراً دیگر افراد اور اداروں کے دوش بدوش تبلیغی جماعت کی ان کوششوں نے بفضلہٖ تعالیٰ ان دشمنانِ اسلام کی امیدوں پر پانی پھیر دیا جو یہ آس لگائے بیٹھے تھے کہ بھارت میں مسلمان اسپین کی طرح ختم ہو جائیں گے - لیکن بھارت میں بھی موجودہ پروگرام سے برآمد شدہ نتائج کی روشنی میں پروگرام میں توسیع کی ضرورت پر غور ضروری ہے -

پاکستانی مسلمانوں کی ذمہ داریاں اور تبلیغی جماعت کا کردار

پاکستان میں مسلمانوں کا مستقبل اس مقصد کے حصول سے وابستہ تھا اور ہے جس کے لئے ملک کی تقسیم عمل میں آئی تھی - اس مقصد کے حصول کے لئے پاکستانی مسلمانوں پر از روئے قرآن حکیم کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں' ان کو بہت ہی مختصر اور جامع انداز میں حضرت مولانا سید ابو الحسن علی میاں مدظلہ' نے شہدائے بالا کوٹ کی زبان سے کہلوایا ہے ؛

"مگر گوشِ شنوا اور دیدۂ بینا کے لئے ان کا مجموعی پیغام یہ ہے کہ ہم ایک ایسے خطۂ زمین کے حصول کے لئے جدوجہد کرتے رہے ہیں جہاں ہم اللہ کے منشا اور اسلام کے قانون کے مطابق آزادی کے ساتھ زندگی گزار سکیں' جہاں ہم دنیا کو اسلامی زندگی اور اسلامی معاشرے کا نمونہ دکھا کر اسلام کی طرف مائل اور اس کی صداقت و عظمت کا قائل کر سکیں' جہاں نفس و شیطان' حاکم و سلطان اور رسم و رواج کے بجائے خالص اللہ کی حکومت و اطاعت ہو۔ ویکون الدین کلہ للہ (الانفال:۳۹) "اور ہو جائے حکم سب کا سب اللہ کا"۔ جہاں اطاعت و عبادت اور صلاح و تقویٰ کے لئے اللہ کی زمین وسیع اور فضا ساز گار ہو اور فسق و فجور اور معصیت کے لئے زمین تنگ اور فضا ناساز گار ہو' جہاں ہم کو صدیاں گزر جانے کے بعد پھر اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (الحج:۴۱) وہ لوگ کہ اگر ہم ان کو قدرت دیں ملک میں تو وہ قائم رکھیں نماز اور دیں زکوٰۃ اور حکم کریں بھلے کام کا اور منع کریں برائی سے"۔ کی تفسیر پیش کرنے کا موقع مل سکے۔ تقدیرِ الٰہی نے ہمارے لئے اس سعادت و مسرت اور اس آرزو کی تکمیل کے مقابلہ میں میدانِ جنگ کی شہادت اور اپنے قرب و رضا کی دولت کو ترجیح دی' ہم اپنے رب کے اس فیصلہ پر رضامند و خورسند ہیں۔ اب اگر اللہ نے تم کو دنیا کے کسی حصہ میں کوئی ایسا خطۂ زمین عطا فرمایا جہاں تم اللہ کے منشا اور اسلام کے قانون کے مطابق زندگی گزار سکو اور اسلامی زندگی اور اسلامی معاشرہ قائم کرنے میں کوئی مجبوری مخل اور کوئی بیرونی طاقت حائل نہ ہو' پھر بھی تم اس سے گریز کرو اور ان شرائط و اوصاف کا ثبوت نہ دو جو مہاجرین و مظلومین کے اقتدار اور سلطنت کا تمغۂ امتیاز ہیں تو تم ایسے کفرانِ نعمت اور ایک ایسی بد عہدی کے مرتکب ہو گے جس کی نظیر تاریخ

میں ملنی مشکل ہے ۔ ہم نے جس زمین کے چپہ چپہ کے لئے جدوجہد کی اور اس کو اپنے خون سے رنگین کر دیا' اکوڑے اور شیدو کے میدان اور تورو اور مایار کی رزم گاہ سے لے کر بالاکوٹ کی شہادت گاہ تک ہمارے خونِ شہادت کی مہریں اور ہمارے شہیدوں کی قبریں ہیں' تم کو خدا نے اس زمین کے وسیع رقبہ اور سرسبز و شاداب خطّے سپرد فرمائے اور بعض اوقات قلم کی ایک جنبش اور برائے نام کوشش نے تم کو عظیم سلطنتوں کا مالک بنا دیا ۔ ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ (یونس: ۱۴)

"پھر ہم نے تم کو ان کے بعد زمین میں جانشین کیا تا کہ دیکھیں کہ تم کیسے عمل کرتے ہو"۔

اب اگر تم اس سے فائدہ نہیں اٹھاتے اور تم نے آزادی کی اس نعمت اور خداداد سلطنت کی اس دولت کو جاہ و اقتدار کے حصول اور حقیر و فانی مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ بنایا' تم نے اپنے نفوس اور اپنے متعلقین' ملک کے شہریوں اور باشندوں پر خدا کی حکومت اور اسلام کا قانون نہ جاری کیا' اور تمہارے ملک اور تمہاری سلطنتیں اپنی تہذیب و معاشرت اور اپنے قانون و سیاست اور تمہارے حاکم اپنے اخلاق و سیرت اور اپنی تعلیم و تربیت میں غیر اسلامی سلطنتوں اور غیر مسلم حاکموں سے کوئی امتیاز نہیں رکھتے تو تم آج دنیا کی ان قوموں کے سامنے جن سے تم نے مسلمانوں کے لئے الگ خطۂ زمین کا مطالبہ کیا اور کل خدا کی عدالت میں جہاں اس امانت کا ذرہ ذرہ حساب دینا پڑے گا' کیا جواب دو گے؟ خدا نے تم کو ایک ایسا نادر و زرّیں موقع عطا فرمایا ہے جس کے انتظار میں چرخِ کہن نے سینکڑوں کروٹیں بدلیں اور تاریخ اسلام نے ہزاروں صفحے الٹے' جس کی حسرت و آرزو میں خدا کے لاکھوں پاک نفس اور عالی تبار بندے دنیا سے چلے گئے' اس موقع کو اگر تم نے ضائع کر دیا تو اس سے بڑا تاریخی سانحہ اور اس سے بڑھ کر حوصلہ شکن اور یاس انگیز واقعہ نہ ہو گا" ۔ (شہدائے بالاکوٹ کا پیغام اہلِ پاکستان کے نام ۔ ماخوذ از سیرت سیّد احمدؒ شہید' جلد ثانی' صفحات ۲۶۶ تا ۲۷۱)

شہدائے بالاکوٹ کا یہ خطاب ہر پاکستانی مسلمان سے ہے' پاکستان کی ہر حکومت سے ہے' ہر دینی و سیاسی ادارے سے ہے ۔ اسی طرح تمام پاکستانی مسلمان انفرادی و اجتماعی طور پر' اور حکومتیں اور ادارے جو اسلام کے نام پر کام کرتے رہے ہیں جواب دہ ہیں کہ انہوں نے اس سلسلے میں اب تک کیا کردار ادا کیا ۔ ہم دیکھتے ہیں کہ پاکستان کی اکثر و بیشتر جماعتوں نے اپنے پروگرام میں اس مملکتِ خداداد کو صحیح

معنی میں اسلامی مملکت (فروعی اختلاف کے ساتھ) بنانا اپنا نصب العین قرار دیا- یہی حال حکومتوں کا بھی رہا اور ہے یہ دوسری بات ہے کہ اب تک پیش رفت جزوی ہے یا ناکافی ہے۔ اَلسَّعْیُ مِنَّا وَالْاِتْمَامُ مِنَ اللہِ۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر یہ سوال اُبھرتا ہے کہ کیا تبلیغی جماعت بہ حیثیت ایک جماعت کے اور اس سے منسلک افراد انفرادی طور پر اس ذمہ داری کی ادائیگی سے مستثنیٰ ہیں؟ لیکن یہ بات ناقابلِ تردید ہے کہ تبلیغی جماعت ابتدا ہی سے ان معاملات کو "سیاست" اور "دنیاوی" کہہ کر اپنے پروگرام سے خارج سمجھتی رہی ہے اور یہی صورت تا حال موجود ہے-

تبلیغی جماعت کی مرکزی قیادت کا بھارت میں ہونا اور اس کے اثرات

راقم الحروف کے خیال میں مندرجہ بالا صورت حال کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ برّصغیر کی تقسیم کے بعد تبلیغی جماعت کی مرکزی قیادت اب تک دہلی (بھارت) میں رہی ہے - گذشتہ صفحات میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد بھارتی مسلمان ہر قسم کے دباؤ میں زندگی گزار رہے ہیں' یہاں تک کہ بھارتی شہریت رکھنے والا بڑے سے بڑے درجے کا مسلمان اپنے فکر و عمل میں مکمل آزاد نہیں کہا جا سکتا- ایک مجبور و محکوم اقلیت سے تعلق رکھنے والے افراد سے (خواہ وہ کتنے ہی متقی اور پرہیز گار کیوں نہ ہوں) ایک آزاد اور خود مختار ملک کے افراد کی ازروئے قرآن حکیم ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لئے قیادت کے فرائض کی صحیح معنی میں انجام دہی کی توقع نہیں رکھی جا سکتی۔ یوں بھی اسلامی تعلیمات میں آزاد اور محکوم کی ذمہ داریوں میں امتیاز رکھا جاتا ہے - اور وہ بھی بھارت اور پاکستان جیسے ممالک میں جہاں ہر وقت ایک دوسرے سے صف آرائی کا خطرہ رہتا ہے اور ایک ملک کے شہری دوسرے ملک میں شبہ کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں - لہٰذا حیرت نہ ہونی چاہیے کہ تبلیغی جماعت کی قیادت اب تک پاکستانی مسلمانوں کی ذمہ داریوں کا صحیح ادراک نہ کر سکی اور تبلیغی جماعت سے منسلک پاکستانی مسلمانوں کو ان ہی خطوط پر گامزن رکھا جن پر وہ قیامِ پاکستان سے قبل تھے بلکہ یوں کہنا زیادہ صحیح ہو گا کہ اگرچہ بھارت اور پاکستان کے

مسلمانوں کی منزلیں جدا جدا ہیں لیکن اس کے باوجود تبلیغی جماعت کی بھارت اور پاکستان میں سرگرمیوں ؎ میں کوئی قابلِ لحاظ فرق نہیں - تفریغِ اوقات کے ساتھ ساتھ بھارت اور پاکستان دونوں ملکوں میں ہر سال عظیم اجتماعات ہوتے ہیں ' پُردرد دعائیں ہوتی ہیں اور بس - بھارتی مسلمان تو بیچارے مجبور ہیں مگر پاکستانی ؟

ع ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظرِ فردا . . . .

مولانا آزاد نے ایک موقع پر ایک فرانسیسی مصنّف کے حوالے سے مسلمانوں کی ازمنۂ وسطیٰ میں صلیبیوں کے مقابلہ میں کامیابی اور اس کے بعد شکست و ہزیمت خوردگی کا فکر انگیز نقشہ پیش کرتے ہوئے لکھا ہے :

"دعائیں ضرور فائدہ پہنچاتی ہیں مگر انہی کو پہنچاتی ہیں جو عزم و ہمّت رکھتے ہیں ' بے ہمتوں کے لئے تو وہ ترکِ عمل اور تعطّلِ قویٰ کا حیلہ بن جاتی ہیں"

(غبار خاطر ' ص ۱۶۷ـ ۱۷۰)

پوپ اور عیسائیت کی مرکزی تبلیغ

ہو سکتا ہے اس موقع پر ہمارے تبلیغی بھائی پوپ ؎ کا حوالہ دیں جو مرکزی طور پر تمام دنیا میں عیسائیت کی تبلیغ کو کنٹرول کر رہا ہے - ان حضرات کی خدمت میں یہ عرض ہے کہ پوپ کا شہر Vatican city کہلاتا ہے جو اٹلی کے دارالحکومت روم میں واقع ہے - یہ ایک مکمل طور پر آزاد اور خود مختار علاقہ ہے - اگرچہ بہت مختصر ہے - اس میں پوپ کی اپنی حکومت ہے اور اپنی عدالت - دوسرے یہ شہر اٹلی میں ہے جہاں کیتھولک عیسائیوں کی اکثریت ہے - اس طرح پوپ ہر قسم کے دباؤ سے ہر طرح آزاد ہے - تیسرے یہ صحیح ہے کہ کیتھولک عیسائیت کی تبلیغ دنیا کے مختلف ممالک میں مرکزی طور پر پوپ کی نگرانی میں ہو رہی ہے - لیکن جو پروگرام جس ملک کے لئے بنایا جاتا ہے وہ اس ملک کے سیاسی و معاشرتی حالات ' اس ملک کی زبان و تہذیب نیز رجحانات وغیرہ کے گہرے مطالعے کے بعد تشکیل دیا جاتا ہے اور یہ مطالعہ بھی ان کے نامزد ایسے ماہرین کرتے ہیں جو اس ملک کے حالات سے خود اس ملک کے رہنے والوں سے زیادہ واقف ہوتے ہیں - پوپ کا سیکریٹریٹ ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک

حکومت کا - ہر ایک ملک کے لئے پوپ کے مشیر علیحدہ ہوتے ہیں جو عموماً اس ملک کے ہی شہری ہوتے ہیں - اس طریق کار کی روشنی میں بھی ان پاکستانی مسلمانوں کی قیادت جو تبلیغی جماعت سے منسلک ہیں پاکستانی افراد کے ہاتھ میں ہونی چاہیے تھی - اگر ایسا ہوتا تو اغلب ہے کہ پاکستان میں تبلیغی جماعت کا پروگرام ایسا بنایا جاتا جو ان ذمہ داریوں سے اگر کلیۃً نہیں تو کم از کم جزوی طور پر ہم آہنگ ہوتا جن کا تعلق پاکستان سے ہے اور جن کی نشان دہی (اللہ پاک جزائے خیر دے) مفکرِ اسلام حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی میاں مدظلہ نے باوجود بھارتی شہری ہونے کے 'شہدائے بالاکوٹ کے نام' سے کی ہے[۵]

تبلیغی جماعت کی عدم توجہی کی توضیح

یہ یقین کرنے کے لئے کافی گنجائش موجود ہے کہ حضرت مولانا علی میاں مدظلہ کی یہ تحریر جو قریباً بیس سال پرانی ہے اور پاکستان میں خوب شائع ہو رہی ہے' تبلیغی جماعت کے ذمہ دار افراد کے علم میں ضرور آئی ہو گی اور ہو سکتا ہے خود مولانا مدظلہ نے بھی جو تبلیغی جماعت کی قیادت سے قریب تر ہیں پاکستانی قیادت کو ان ذمہ داریوں سے آگاہ کیا ہو گا - بہر صورت اس تحریر کے بعد تبلیغی جماعت کا پاکستان میں اسی محدود اور ابتدائی پروگرام پر عمل پیرا رہنا سمجھ سے بالاتر ہے - قیاس یہ کہتا ہے کہ تبلیغی جماعت کے قائدین کا تعلق شاید علماء کے اس گروہ سے ہو جو تخلیقِ انسان کے مقاصد میں "نیابتِ الٰہی" کو نظر انداز کر دیتے ہیں[۶] اور عبادت کے محدود تصور کو ہی مقصدِ حیات اور ذریعۂ نجات سمجھتے ہیں' جو جیسا کہ گزشتہ صفحات میں واضح کیا جا چکا ہے نتیجہ ہے صدیوں کی غلامی کا یا پھر وہی دیرینہ مشکل ہے۔

آئینِ نو سے ڈرنا ' طرزِ کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

اس قیاس کو تبلیغی جماعت کی اسلامی قانون کے نفاذ اور اسلامی معاشرے کے قیام سے عدم دلچسپی' نظریۂ جہاد سے پہلو تہی' رفاہی امور کی طرف سے بے رخی' مشرقی پاکستان کی علیحدگی پر عدم تشویش وغیرہ وغیرہ سے تقویت ملتی ہے - اس نتیجہ پر پہنچ کر ہم

تبلیغی جماعت سے متعلق ایک غیر ملکی (مصری) مفکر کا تجزیہ پیش کرتے ہیں۔

وعظ وارشاد کا طریقہ اور تبلیغی جماعت کا تجربہ

"بسا اوقات انفرادی طور پر خطباء اور دعوت وارشاد کا کام کرنے والے وعظ و تلقین کا طریقہ اختیار کرتے ہیں ۔ یہی طریقہ تبلیغی جماعت نے اجتماعی طور پر اختیار کیا ہے اور یہ اسلوب اپنایا ہے کہ رفقائے جماعت ہفتہ میں چند گھنٹے، مہینہ میں ایک دن اور سال میں ایک ماہ ضرور جماعت کے ساتھ گزاریں اور اسلامی دنیا کے مختلف حصوں میں تبلیغ کے لئے نکل جائیں

بلاشبہ تبلیغی جماعت کے اصحاب میں خلوص، جذبہ اور صدقِ مطلوب موجود ہوتا ہے، لیکن ان کا یہ اسلوبِ دعوت دورِ جدید کی سرکش اور متمرد جاہلیت کے مقابلے اور اس سے نبرد آزما ہونے کی سکت نہیں رکھتا۔ کیونکہ

الف) اس طریقہءکار سے ایسی اجتماعی تحریک برپا نہ ہو گی جو عملاً جاہلیتِ جدیدہ سے مزاحمت کر کے ایک اسلامی معاشرے کے قیام اور اسلامی ریاست کی تشکیل کی راہ ہموار کر سکے۔

ب) اس طریقہ کا اصل اثر مساجد تک محدود رہے گا اور ان جدید طبقوں میں سرایت نہیں کرے گا جن کے ہاتھوں میں دورِ جدید کی زمامِ کار ہے اور جو سوادِ اعظم کی نمائندگی کرتے ہیں۔

ج) جدید افکار اور فلسفیانہ موشگافیوں کا مقابلہ اس طریقہ سے نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ بالعموم اس طریقہءدعوت میں ترغیب و ترہیب پر زور ہوتا ہے اور یہ اسلوب انہی لوگوں پر اثر انداز ہو سکتا ہے جو پہلے ہی کسی درجے میں دین دار ہوں۔

د) اس طریقہءکار میں بظاہر یہ منصوبہ بندی شامل نہیں ہے کہ فصل کی تیاری کے لئے بیج ڈالے جائیں اور ان کے نشوونما کی مساعی کی جائیں تا آنکہ ان کے ثمرات ظاہر ہو جائیں۔ یہ کچھ اس طرح کا کام ہے جیسے طاہر الجزائری اور جمال الدین افغانی نے کہا کہ: "کلمہ حق کہہ دو اور بس"۔ اس میں نہ صرف یہ کہ نتیجہ بہت دیر میں برآمد ہو گا بلکہ سرے سے کسی نتیجے تک پہنچنے کی کوئی ضمانت نہیں ہے"۔

مندرجہ بالا تحریر سے بخوبی واضح ہے کہ تبلیغی جماعت کے پروگرام کی منزلِ مقصود نہ اسلامی معاشرے کا قیام ہے اور نہ اسلامی ریاست کی تشکیل۔ ایسے پروگرام

سے کسی بھی ملک کو ضرر کا اندیشہ نہیں ہو سکتا - یہی وجہ ہے کہ بھارت کو دہلی میں تبلیغی جماعت کا مرکز گوارا ہے اور اس کا پروگرام ہر اسلامی و غیر اسلامی ملک کے لئے یکساں ہے -

گزارش

قیامِ پاکستان کو چالیس سال سے زیادہ ہو گئے اور اس تمام عرصہ میں ہمارے ملک میں اسلامی قانون کے نفاذ کی جدّوجہد جاری رہی ہے - اس سلسلہ میں کچھ پیش رفت بھی ہوئی ہے - لیکن اسلامی معاشرے کے قیام کی منزل ابھی بہت دور ہے - تبلیغی جماعت میں صالح افراد کی قوت موجود ہے - اس کے اجتماعات میں لاکھوں افراد شریک ہوتے ہیں - اگر وہ اپنے پروگرام میں حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی میاں مدّظلّہ کی از روئے قرآن حکیم نشان دہی کی ہوئی ذمہ داریوں کو بھی شامل کر لیں تو سالوں کی منزل انشاء اللہ مہینوں میں طے ہو سکتی ہے - ع

طے شود جادۂ صد سالہ بہ آہے گاہے

اعادہ

راقم الحروف نے ابتداء ہی میں اپنے مقصد و مدّعا کا اظہار کر دیا ہے - اس کے باوجود دوبارہ اس نیّت کا اعادہ کیا جاتا ہے کہ ناچیز کی اس کاوش کا مقصد ایک خوشگوار فضا میں حقیقت پسندوں کو دعوتِ فکر دینا ہے - لہٰذا ہم نے حتی المقدور سنجیدگی اور متانت سے اپنے موقف کو پیش کیا ہے - یوں بھی تبلیغی جماعت کے قائدین (خواہ بھارتی شہری ہوں یا پاکستانی) ہمارے لئے واجب الاحترام ہیں - ہم نے ابلاغ کی شرائط پوری کرتے ہوئے سب پہلوؤں پر نظر ڈالی ہے اور ایسے بزرگ کی تحریر کو بنیاد بنایا ہے جو اس وقت دنیائے اسلام میں صفِ اوّل کے مفکّرین میں سے ہیں اور جو خود تبلیغی جماعت سے وابستہ بھی ہیں - اللہ پاک سے دعا ہے کہ ہم سب کو ہدایت عطا فرمائے - آمین

---

(۱) کچھ عرصہ قبل مجلس نشریات اسلام، کراچی نے اس کو ایک پمفلٹ کی شکل میں چھپوا کر تقسیم کیا تھا -

(۲) یہ بات اصول کے طور پر کہی گئی ہے۔ اس سے مقصد کسی بزرگ کی دیانت یا اتقاء پر حرف گیری نہیں۔ راقم الحروف کے لئے وہ سب واجب الاحترام ہیں۔

(۳) دار العلوم کورنگی، کراچی سے جاری کردہ فتویٰ (البلاغ، اپریل ۱۹۸۷ء) بھی ملاحظہ کیا جائے۔

(۴) کاش مسلمانانِ عالم میں کوئی ایسا فرد ہوتا جسے ہم پوپ کا مقابل کہہ سکتے۔

(۵) حضرت مولانا کی یہ حوصلہ مندی خود مولانا کے حضرت سید احمدؒ شہید سے تعلق کا اظہار ہے۔

(۶)۔ ملاحظہ کیجئے کتابچہ "العلم" (انگریزی) شائع کردہ مجلس العلماء، جنوبی افریقہ، ص ۲، ۳ (ترجمہ سطور ذیل میں ہے)؛ اس فکر کے نتیجے میں "علم" کی تعریف محدود ہو کر رہ گئی کیونکہ "انی جاعل فی الارض خلیفۃ" کے ساتھ ساتھ "علم آدم الاسماء" بھی نظر سے محو ہو گیا'

روئے زمین پر انسان کی تخلیق کا مقصد

قرآن پاک دوٹوک الفاظ میں اعلان کرتا ہے: وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون (الذاریات: ۵۶)

"عبادت" سے عمومی طور پر "پوجا پاٹ" مطلب لیا جاتا ہے۔ اس نامکمل مطلب سے "رسمی عبادت" کا تاثر ابھرتا ہے۔ لیکن "عبادت" کا مقصد صرف "پوجا پاٹ" ہی نہیں۔ "عبادت" کا مادہ "عبد" ہے جس کا مطلب غلامی ہے۔ اسی لئے عربی زبان میں غلام کو "عبد" کہا جاتا ہے۔ ایک غلام اپنے آقا کی ملکیت ہوتا ہے۔ اسلام میں "مومن" "عبد" ہے یعنی اللہ کا غلام۔ کیونکہ "عبد" اپنی کوئی خواہش نہیں رکھتا لہٰذا اس کی (عبد کی) زندگی اپنے خالق کے حکم کی مکمل اطاعت کا آئینہ ہونا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کامل فرمانبرداری انسان کی تخلیق کا مقصدِ اوّلین ہے۔ اب اللہ کے غلام کی حیثیت سے ہمارا کام اللہ کی رضاجوئی اور احکام کی تعمیل ہے۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ ہمیں اللہ کے احکام سے پوری طرح واقف ہونا چاہئے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے احکامات کی کامل فرمانبرداری مقصود ہے۔ لہٰذا ہم کو قوانین خداوندی کا علم ہونا چاہیے جن کے مطابق ہم کو اپنی دنیاوی زندگی ڈھالنی ہے تاکہ ہم بجا طور پر اللہ تعالیٰ کے غلام کہلانے کے مستحق ہوں۔ اطاعتِ کامل، اللہ کی مکمل فرمانبرداری جیسا کہ قرآن پاک اور سنتِ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) میں حکم دیا گیا ہے جب ہی مکمل ہو گی جب ہم اللہ کی رضامندی اور ناراضگی سے متعلق قوانینِ خداوندی کا علم حاصل کریں۔ اللہ کی خوشنودی کے حصول کے نظریہ کی روشنی میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: طلب العلم فریضہ علی کل مسلم و مسلمہ اس علم کا حصول جس کے ذریعے سے غلام اپنے آقا اور خالق کی معرفت حاصل کر سکے... وہ علم جو ان طریقوں اور راہوں کی نشان دہی کر سکے جن کو اپنا کر اس فرض کی ادائیگی ہو "فرض یا واجب" ہے۔

(۷) "کارِ دعوت کی دشواریاں اور مسائل" از فتحی یکن، صفحہ ۱۶۵ و ۱۶۶، اردو ترجمہ از ساجد الرحمٰن صدیقی

"ندا"۔ پیپلز پارٹی اور جماعتِ اسلامی

شکایتیں ۔ حکایتیں ۔ وضاحتیں

اقتدار احمد

"ندا" کو شائع ہوتے اور صحافت سے میری دور کی صاحب سلامت کو پونے دو سال ہونے کو آتے ہیں۔ اس دوران مجھے اپنے قارئین کی طرف سے سینکڑوں ہی خطوط موصول ہوئے' مدح کے بھی اور ذم کے بھی۔ ان میں سے اکثر کی نمائندگی "نامے میرے نام" میں ہوتی رہی تاہم یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں ان کے مختصر جواب بھی ساتھ ہی دے دیا کرتا تھا۔ بعد میں جب تجربہ کار صحافیوں نے مشورہ دیا کہ قارئین کے خطوط تمہارے جواب یا تبصرے کے بغیر شائع ہونے چاہئیں تو اگرچہ یہ مشورہ قبول کر لیا تاہم ان خطوط کی اشاعت کم ہو گئی۔ ممکن ہے کہ اس میں میری عدم دلچسپی کو بھی کچھ دخل ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ "ندا" کے دامن میں اکثر ان کے لئے جگہ نہیں نکلتی تھی۔

قارئین کے مراسلات کے ذریعے ایک جریدے اور اس کے پڑھنے والوں کے درمیان ایک مؤثر رابطہ رہتا ہے جو میری اس کوتاہی یا "ندا" کی تنگ دامانی کے باعث بظاہر مجروح ہوا لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انہیں نظر انداز کر دیا گیا ہو۔ مجھے اپنے پڑھنے والوں سے جو ایک تعلق میسر آیا وہ کسی بھی وقت منقطع ہو سکتا ہے' ندا کے دم توڑ جانے پر یا میری دگرگوں صحت کے جواب دے دینے کی وجہ سے اور موت کی تلوار جو ہر وقت سر پر لٹکی ہوئی ہے' وہ اپنی جگہ۔ ہر ذی روح کی طرح مجھے بھی اپنے کئے اور کہے کا اللہ تعالیٰ کو جواب دینا ہے اور میرے نزدیک وہ لوگ جو کسی درجے میں لوگوں کی فکری و عملی رہنمائی کے منصب پر فائز ہیں' ان کی سوا مشکل ہے۔ اپنی ذاتی زندگی کے علاوہ انہیں اس منصب سے متعلق ذمہ داریوں کی زیادہ کڑی باز پرس کا سامنا ہو گا۔ علمائے دین' دانشور اور صحافی لاپروائی یا بے نیازی کا رویہ اپنائیں تو اس کا اختیار انہیں اللہ نے ہی دے رکھا ہے ورنہ ہونا یہ چاہئے کہ وہ ایک ایک لفظ تول کر بولیں اور لکھتے ہوئے بھی قلم کو خود سر نہ ہونے دیں۔ میں نے اس مختصر عرصے میں جو تھوڑا بہت لکھا اور جس موادِ مطالعہ کو اپنے قارئین تک پہنچانے کا ذریعہ بنا' اس کے لئے اللہ تعالیٰ کو تو جواب دہ ہونے میں شبہ ہی نہیں' اپنے قارئین کو بھی حساب دینے کا پابند ہوں بالخصوص ان مہربان دوستوں کو جنہوں نے کسی بھی طور "ندا" سے تعاون کیا۔ سو آج اس کا موقعہ بھی پیدا ہو گیا کہ اوپر نیچے کئی عتاب نامے موصول ہوئے ہیں۔ ساتھ ہی ڈیڑھ دو ماہ کی ایسی علالت سے بڑی حد تک افاقہ ہوا ہے جس کے دوران میں ... پر حاضر ہوتے بھی غیر حاضر تھا اور اب محسوس ہوتا ہے صحت اتنی قابلِ اعتماد نہیں رہی کہ آج کا کام کل پر ڈال سکتا ہوں۔

اس وضاحت کا خیال آتے ہی میرے تخیل نے وقت کے پہیے کو اُلٹا گھما دیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ زندگی بھر کی اُس مشقت کے بعد جس نے ہڈیوں کے گودے کو بھی خشک کر دیا تھا' میرے آقا و مولا اور اللہ کے آخری رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے

وداعی حج کے موقعہ پر مسلمانوں کے سب سے بڑے اجتماع سے مخاطب ہیں۔ اپنے عظیم مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دینے کے بعد موٹی موٹی باتوں کی تاکید کر کے مجمع سے سوال فرماتے ہیں۔ "کیا میں نے تم تک اللہ کا پیغام پہنچا نہیں دیا" اور لوگوں کے بیک زبان یہ جواب دینے پر کہ "کیوں نہیں' یا رسول اللہ! ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ نے بات پہنچانے' نصیحت کرنے اور اپنا فرض پورا کرنے کا حق ادا کر دیا" آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے تین بار انگلی اٹھا کر فرماتے ہیں "اے اللہ تو بھی گواہ رہیو" ۔ مجھے اپنے آقا و مولا سے اپنی نسبت پر فخر ہے جو چاہے سمندر سے قطرے کی نسبت سے زیادہ نہ ہو اور میرے مشن اور اپنے قارئین سے میرے تعلق کی نوعیت اس صورت حال سے کتنی ہی مختلف کیوں نہ ہو جس کا میں نے حوالہ دیا تاہم اس یقین کے ساتھ بھی کہ میری نیت اور میرے کئے دھرے سے عالم الغیب والشہادۃ خوب واقف ہے' میں دنیا والوں کو اپنی اس مختصر صحافیانہ زندگی کا حساب دینے بیٹھا ہوں جو میں نے کسی ادعا کے بغیر شروع کی اور جسے نفع نقصان کا حساب کئے بغیر کسی بھی وقت ختم کرنے کا فیصلہ بھی کر سکتا ہوں کہ میری معاش بحمد اللہ 'اس سے وابستہ نہیں۔

معصومیت ہمارے نزدیک انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ ختم ہو گئی اور میں تو اپنی طبعی کمزوریوں کی وجہ سے خطا' نسیان اور معصیت کے تیروں کی زد پر عام مسلمانوں سے بھی زیادہ رہتا ہوں تاہم ارادہ "ندا" کے اجراء سے یہ تھا کہ کاروباری صحافت کے فروغ کے اس زمانے میں نظریاتی اور اصولی صحافت کا ایک چراغ روشن کروں' پیش نظر لائحۂ عمل نصیحت و خیر خواہی کا وہی مفہوم اور دائرہ کار تھا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک معروف حدیث مبارک سے ملتا ہے اور اپنی سی کوشش کی ہے کہ اس پر قائم بھی رہوں۔ خطا اور نسیان کی اس رعایت کا اپنے آپ کو مستحق گردانوں جو اللہ سے ڈرنے والے اس کے بندوں کو بھی حاصل ہے اور اپنی تحریروں کے ذاتی پسند و ناپسند کے اثرات سے ہمیشہ آزاد رہنے کا دعویٰ نہ کروں تو اپنے تئیں اطمینان سا محسوس کرتا ہوں کہ اپنے ارادے پر استقامت سے عمل کیا ہے' اب بھی کر رہا ہوں اور اللہ توفیق دے تو آئندہ بھی کرتا رہوں گا۔ بایں ہمہ چند تازہ خطوط کے حوالے سے کچھ معروضات کے ساتھ حاضر ہوا ہوں ۔ اتفاق سے یہ خطوط ان سب شکائتوں کا احاطہ کرتے ہیں جو اپنے اپنے انداز میں میرے دوستوں نے مجھ سے اب تک کی ہیں اور ان پر گفتگو کرتے ہوئے میں اس پوری فردِ جرم کا جواب دینے کی کوشش کر رہا ہوں جو ٹکڑوں میں وقتاً فوقتاً مجھ پر لگائی گئی۔ پہلے مختصر تعارف کے ساتھ آپ وہ خطوط پڑھ لیجئے۔

ابوظبی سے میرے خیر اندیش بھائی' محمد اشرف لکھتے ہیں۔

مکرمی جناب اقتدار احمد صاحب

السلام علیکم - بہت سوچ بچار اور ذہنی کوفت کے بعد ہمت کر کے آپ کو چند گذارشات پیش کر رہا ہوں - نہ تو اشاعت مقصود ہے نہ کسی کی تضحیک لیکن ایک بات جو کھٹک جائے اس کو اگلے تک پہنچانا فرض سمجھتا ہوں -

اشاعت کے روزِ اوّل سے آپ کے پرچے کا واضح جھکاؤ پیپلز پارٹی اور اس کی سیاست کی طرف رہا ہے اور اس کی وجہ آپ یہ بیان کرتے ہیں کہ وہ ملک گیر جماعت ہے اور بقول آپ کے اس کا ساتھ دینا جمہوریت کے لئے ضروری اور بدرجۂ مجبوری ہو گیا ہے - تسلیم کیا ہم نے - لیکن جو کچھ آپ کے پرچے میں مواد ملتا ہے وہ صرف اور صرف جماعت اسلامی سے دشمنی کے باعث پیپلز پارٹی کے ساتھ تعاون ہے ورنہ پیپلز پارٹی میں جمہوریت تو شاید اس کے یوم تاسیس سے نظر نہیں آتی

میرے نزدیک پیپلز پارٹی دین بیزار اور اوباش لوگوں کی پارٹی ہے - وہ دم مست قلندر اور بے جمالو کے علاوہ کچھ بھی نہیں - اور صاف ظاہر ہے کہ اس دور میں ملک کی ایک عظیم اکثریت دین اور اسلام کے تقاضوں کی پابندی کو گوارا نہیں کرتی اور ایمان باللسان ہی ان کے نزدیک اسلام ہے اور بس - یہی وجہ ہے کہ پیپلز پارٹی نے بھی "اسلام ہمارا دین ہے" کا نعرہ لگایا جبکہ اسلام ان کے ہاں دور بین سے بھی نظر نہیں آئے گا اور اس سب کا اعتراف آپ "محاضرات کراچی ۸۸ء" میں بھی کر چکے ہیں -

آپ کے پرچے کے تمام رپورٹر، خصوصی نمائندے اور خود آپ کے اداریے اس بات کے گواہ ہیں کہ آپ کے تمام ۹۰ فی صد رپورٹر اس (آپ کی مدد سے) پارٹی کے جیالے ہیں - انہیں انٹرویو بھی ملتا ہے تو اسی پارٹی کا اور اس کے لیڈروں کا، تازہ ترین مثال سلمان تاثیر - پھر یہ جیالے خواہ وہ فخر زمان ہوں یا تاثیر صاحب، ان کی زبان قطع و برید کے باوجود تُو تُوئیں میں اور گالی گلوچ سے بھری ہوتی ہے جبکہ آپ ہر ممکن کوشش کے بعد ایسے ایسے جیالوں کو ڈھونڈ لاتے ہیں جن کو صحافیانہ معراج آپ کے پرچے میں آ کر ملی اور وہ خوب خوب دوسرے سیاسی لوگوں پر کیچڑ اچھالتے ہیں - نواز شریف تو انہیں خواب میں بھی ڈرانے لگا ہے اور کچھ کچھ حال آپ کا بھی ایسا ہی ہو رہا ہے - حالانکہ نواز شریف بھی عوام کا منتخب نمائندہ ہے اور کوئی غنڈہ بدمعاش نہیں - مروجہ انتخابی سیاست میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ نواز شریف بھی کر رہا ہے - اگر یہ بدمعاشی ہے تو اس کا ڈول تو آپ کے بڑے لیڈر مرحوم بھٹو نے ڈالا تھا اور اب ان کی بیٹی بھی یہی کر رہی ہے -

ماتا کہ آپ انہیں (بی بی کو) بھی پند و نصیحت کرتے ہیں لیکن یہ واقعی نصیحت ہوتی ہے اور بہت سلجھے انداز میں ہوتی ہے لیکن فریقِ مخالف کے لئے آپ کا قلم زہر اگلنے لگتا ہے - پتہ نہیں کیوں ؟ - نصیحت کا حق دونوں طرف یکساں غیر جانبداری سے ہونا چاہئے -

جماعت اسلامی سے اختلاف صرف اور صرف انتخابات کا طریقہ اپنانے میں ہے لیکن انہی انتخابات کے لئے پیپلز پارٹی کی مدح ہوتی ہے اور سارا جرم، سارے الزام جماعت اسلامی کے دیئے جاتے ہیں -

خدا را اللہ کی گرفت سے بچیں - اگر جمہوریت کے لئے ہم بے دین اور آوارہ لوگوں کو حوصلہ دلا سکتے ہیں اور ان کے ساتھ ہمدردیاں کر سکتے ہیں تو اسلام کے لئے تمام اسلامی جماعتوں کی مخالفت ہماری سمجھ سے باہر ہے - آپ کو شاید جمہوریت اسلام سے زیادہ عزیز ہو گئی ہے - آپ کس کس طرح لوگوں کی کردار کشی کرتے ہیں اور کیسے کیسے جرائم کی ڈھونڈ ڈھونڈ کر تشہیر کرتے ہیں، ایک مثال کے بعد معذرت چاہوں گا - ضلع گجرات میں چونکہ چودھری شجاعت "بی بی" کے مخالف ہیں، آپ نے ان کے حلقے میں قتل کی "وارداتوں" کو ڈھونڈ کر نکالا لیکن اسی ضلع میں پیپلز پارٹی کے ایم پی اے کی حمایت سے تحصیل کھاریاں میں مرزائیوں نے مسلمانوں پر جو قیامت ڈھائی اس کی آپ کو خبر تک نہ ہوئی کیونکہ آپ کے نمائندہ خصوصی "بی بی" کی دی ہوئی عینک سے دیکھتے ہیں -

خدا کے لئے لوگوں کی کردار کشی نہ کریں - اگر اتنا درد جمہوریت کا ہے تو دونوں اطراف کے لوگوں کو پرچے میں جگہ دیں - ہاں اگر اشتہار مقصود ہیں تو وہ تو اب آپ کو ملنے لگ گئے ہیں - اس انتہائی کڑوی تحریر پر معذرت چاہوں گا -

لسٹر (برطانیہ) سے ایک دوسرے خیر اندیش مہربان، محمد صادق کھوکھر رقم طراز ہیں -

محترم جناب اقتدار احمد صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ

میں ہفت روزہ "ندا" کا مستقل قاری ہوں - لیکن مجھے بڑی حیرت ہوتی ہے کہ تقریباً ایک سال کے اندر آپ نے اتنے مضامین تنظیم اسلامی اور اس کے اغراض و مقاصد وغیرہ پر نہیں لکھے جتنے آپ نے کسی نہ کسی حوالے سے جماعت اسلامی پر تنقید کرنے والے مضامین شائع کئے ہیں - کیا تنظیم اسلامی کی دعوت یہی ہے ؟ جب آپ نے تنظیم اسلامی کے تحت کام کرنا شروع کر دیا ہے اور اسی کو آپ آئیڈیل سمجھتے

ہیں تو پھر جماعت اسلامی سے امیدیں باندھنا اور نصیحتیں کرنا فضول ہے - آپ اپنا کام کریں - یہ وقت ہی فیصلہ کرے گا کہ کس نے کیا خطا کی تھی - اگر تنظیم اسلامی جلد انقلاب لانے کا ٹھان چکی ہے تو پھر دوسروں سے امیدیں نہ باندھے -

ایک اور محترم مکتوب نگار 'رئیس اللہ شمس صاحب (ناظم آباد کراچی) نے طنزیہ پیرائے میں احتجاج کیا ہے کہ ان کے ایک خط میں سے جو ۱۴/ نومبر کے "ندا" میں شائع ہوا' ایک پورا اور خاص معنویت کا پیرا حذف کر دیا گیا جو شائع شدہ پہلے اور آخری پیرے سمیت درج ذیل ہے -

"ندا" کی ۳۱ اکتوبر ۸۹ء کی اشاعت میں "گریبان میں جھانک کر دیکھئے" اور "سیف کموز میں خواتین کی شرکت کار دعمل" کے عنوان سے آپ کی تحریریں اخلاص نیت اور خیر خواہی کے جذبے کے ساتھ فریضۂ تبلیغ کی ادائیگی کا قابلِ تقلید نمونہ ہیں - شعائرِ دین کی پامالی پر "ندا" کی بروقت توجہ' تشویش اور کڑھن تمام صاحبانِ ایمان کے دلوں کی ترجمان ہے تاہم منکرات کو ہاتھ سے ختم کرنا حاصل ایمان اور مقصد حیات ہے -

الحمد للہ کہ دینی جماعتوں میں جماعت اسلامی اس اعلیٰ ترین تقاضۂ ایمان سے بدرجۂ اولیٰ غافل نہیں - یہی وجہ ہے کہ ہمیں کئی بنیادی کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں مثلاً پاکستان میں قادیانیوں کو اقلیت قرار دینا' دین و سیاست کے جداگانہ تصور کا خاتمہ' علماء و مشائخ کا میدان عمل (سیاست) میں حصہ لینا اور دوامِ اقتدار کو اسلام کے بغیر ناممکن سمجھنا - ان بنیادی کامیابیوں کے باوجود جماعت اسلامی کی تبلیغ دین ہنوز جاری ہے کیونکہ اخلاص نیت کے ساتھ اسلام کے احکامات پر اجتماعی عمل کی منزل ابھی سر ہونا باقی ہے - یہاں یہ تذکرہ بے محل نہیں کہ جماعت اسلامی نے کسی دینی' اصلاحی اور مثبت تحریک و جماعت کو کبھی اپنا حریف تصور نہیں کیا بلکہ اسے اپنے ہی پروگرام کا حصہ جانا اور موقع کی مناسبت سے دست تعاون دراز کرنے کو عار نہیں سمجھا جس پر یہ پھبتی بھی کسی جاتی ہے کہ ٹھلاوں کے بغیر جماعت کا تصور ممکن نہیں -

مدیر محترم - وطن عزیز میں ایک منو بھائی نہیں ہے - آخر آپ کس کس کو گریبان میں جھانکنے کی دعوت دیں گے - برائیوں اور منکرات کے خلاف خاموش مظاہرے بلاشبہ حرارت ایمانی کا عکس ہیں - تبلیغی چلّے' گشت اور اجتماعات بھی برحق لیکن سوچئے کیا باعمل مسلمانوں کے بس میں یہی کچھ رہ گیا ہے - عرصہ ۴۲ سالوں میں امر بالمعروف پر جتنا کام ہوا ہے اگر اس کا نصف بھی نہی عن المنکر پر ہوتا تو شاید خاموش مظاہروں' چلّوں اور گشتوں کی نوبت ہی نہ آتی اور اگر تھوڑی بہت ضرورت محسوس بھی ہوتی تو منو بھائی جیسا کردار ہرگز پیدا نہ ہوتا جو "گریبان" رکھتے ہوئے بھی جھانکنے کی نعمت سے محروم ہے -

آخری خط کے بارے میں عرض ہے کہ دوسری باتوں کے علاوہ جن کا ذکر مجموعی وضاحت میں آ جائے گا' اس مراسلے میں قطع و برید کا سبب جگہ کی قلت بھی تھا - اسی شمارے میں ان کے مذکورہ خط کے بعد چھپنے والے رحمان مذنب صاحب کے مراسلے کا پہلا اور بڑا پیرا بھی قینچی کی نذر ہو گیا جس میں انہوں نے "ندا" کے بعض مضامین کی نام لے لے کر ستائش کی تھی -

مجموعی وضاحت جس میں بلاواسطہ یا بالواسطہ سب الزامات کا جواب آ جائے گا' پیپلز پارٹی کے ساتھ میرے تعلق سے شروع ہونی چاہئے - اس پارٹی کے لئے میرے دل میں ذرا سا نرم گوشہ مارشل لاء کے دور میں جناب ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی پھانسی اور ان کے خاندان کے علاوہ دوسرے کارکنان و وابستگان پر دورِ ابتلاء کے آغاز کے ساتھ پیدا ہوا - اس سے پہلے کی تاریخ یہ ہے کہ ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں بڑے بھائی اظہار احمد قریشی کی انتخابی مہم میں حصہ لینے کے لئے اپنی کمپنی کے چیدہ چیدہ ملازمین اور میسر

ٹرانسپورٹ کو لے کر کراچی سے جوہر آباد (سرگودھا) آیا جو وہاں سے جماعت اسلامی کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کی نشست کے لئے دوسرے امیدواروں کے علاوہ پیپلز پارٹی کے جناب نسیم آہیر سے بھی مقابلہ کر رہے تھے۔ بھٹو صاحب کے دورِ اقتدار میں جب مزدور تنظیموں نے ان کی جماعت کی شہ پر آجروں کا جینا حرام کر رکھا تھا' مجھے اپنے کاروبار کو سنبھالنے کے ساتھ نوعمر لیبر اور سٹاف یونینوں کے ساتھ جو لکھی لڑائی لڑنی پڑی کیونکہ اس کا پھیلاؤ مالیت سے غیر معمولی حد تک زیادہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کاروبار ٹھپ ہو گیا جو ۱۹۷۳ء کے بعد آنے والی خوفناک مہنگائی کے ہاتھوں پہلے ہی نیم جاں تھا۔ ۱۹۷۷ء کے الیکشن میں میرا قیام لاہور میں تھا اور ہمارے (میرا اور میری بیوی کا) دو ووٹ ملتان میں تھے تو میں نے محض پیپلز پارٹی کے خلاف اپنے صرف دو ووٹ استعمال کرنے کے لئے پورے کنبے کو کار میں لاد کر دو سو دس میل کا سفر طے کیا اس حال میں کہ کار پر قومی اتحاد کا ڈیڑھ گز لمبا پرچم لہرا رہا تھا۔ وہاں پولنگ کے دوران فائرنگ ہوئی اور بھگدڑ بھی مچی لیکن ہم نے لوگوں کی چیخ و پکار کے باوجود اپنی قطاروں سے نکلنا منظور نہ کیا اور وہاں سے جماعت اسلامی کے امیدوار خضر حیات صاحب کو (جو بعد میں ہائی کورٹ کے جج بھی بنے) جتوا کر واپسی ہوئی۔ پی این اے کی تحریک کے دوران میں اس درجہ پُرجوش رہا کہ ٹیکسلا اور واہ چھاؤنی کے علاقے میں جہاں ان دنوں میری کاروباری سرگرمی زیادہ تھی' پیپلز پارٹی کی نظروں میں آ گیا اور اطلاع ملی تھی کہ پارٹی کے مبینہ قتل عام کے پروگرام میں میرا نام بھی وہاں کے ایک جیالے کی "ہٹ لسٹ" پر ہے۔ واللہ اعلم۔ ہاں ان خاص قسم کی سختیوں سے مجھے پالا نہ پڑا جو اہل سیاست اور صحافیوں کے حصے میں آئی ہوں گی اس لئے کہ میرا تعلق ان دونوں طبقات سے دُور کا بھی نہ تھا۔

اس پس منظر کی دوسری جہت یہ ہے کہ اگرچہ مجھے پارسائی کا دعوی نہیں اور آج بھی دن بھر میں درجنوں گناہ سرزد ہوتے ہیں تاہم ذاتی اور گھریلو زندگی' وضع قطع' نشست و برخواست' رہن سہن اور فکر و عمل کے میرے انداز میں پیپلز پارٹی کے وابستگان کے مخصوص طرز زندگی اور سوچ کی کوئی جھلک موجود نہیں۔ میرے اعزہ و اقربا اور حلقۂ احباب میں دور و نزدیک پارٹی سے تعلق رکھنے والا کوئی شخص نہیں پایا جاتا۔ اس کے برعکس میرے چاروں طرف پیپلز پارٹی کے مخالفین کی اکثریت اور کٹر معاندین کا غلبہ ہے اور آج "ندا" میں پیپلز پارٹی کی بقول کسے "وکالت" کر کے اور ڈھونڈ ڈھونڈ کر اس کے متعلقین کے انٹرویو لانے اور شائع کرنے کے باوجود پارٹی کی کسی درجے کی قیادت سے میرا کوئی رابطہ نہ کبھی تھا' نہ اب ہے۔ متذکرہ ماضی اور بیان کردہ حال کے مابین کوئی ایسا واقعہ بھی نہیں ہوا کہ مجھے اپنا سیاسی قبلہ بدلنے کی ضرورت محسوس ہوتی۔ عملی سیاست میں حصہ لیا نہ کبھی صاحبِ اقتدار کے قرب کی خواہش دل میں پیدا ہوئی اور نہ کاروبار نے کوئی ایسی نئی شکل اختیار کی جو کسی کی خصوصی نظرِ عنایت یعنی کسی پرمٹ' لائسنس' قرضوں کی طالب ہو۔ اُلٹا ہوا یہ کہ میں تنظیم اسلامی میں باضابطہ شامل ہو گیا جس کے باعث عملی یعنی انتخابی سیاست میں بلاواسطہ یا بالواسطہ ملوث ہونے کے باب پر قفل ہی پڑ گیا' کاروبار بچوں کے حوالے کر کے اس سے لاتعلق ہو گیا اور صحافت کا جو نیا "کاروبار" اپنے لئے پسند کیا ہے اس میں ایسی دن دونی رات چوگنی "وسعت" پیدا ہوئی ہے کہ ہفتے میں ایک دو بار ضرور

اسے بند کرنے کی سوچتا ہوں کیونکہ اب ہمت اور جیب دونوں ہی جواب دینے پر آ گئی ہیں۔ اتنا غیبی اور کودن نہیں ہوں کہ زمانے کی ہوا کا رخ پہچان نہ سکوں اور اتنی موٹی بات بھی سمجھ نہ پاؤں کہ پرچہ بیچنے کا طریقہ کیا ہے لیکن "ندا" پر اگر روزِ اوّل والی کیفیت آج بھی طاری ہے تو اس کی وجہ محض یہ ہے کہ مصلحت کو تج کر میں نے اپنے ضمیر کی آواز کو لبیک کہا ہے اور اپنے قارئین کو سنسنی خیز مواد مطالعہ بہم پہنچانے سے بھی عمداً اجتناب کیا۔ ندا کے سلسلے میں مجھے یہ پیشکش کرنے کی بھی ضرورت نہیں کہ لوگ آ کر میرے حسابات دیکھ لیں۔ صورتِ حال معاصرین پر، ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے نیوز ایجنٹس پر، بازار والوں پر اور سینکڑوں دوسرے متعلقہ افراد اور محکموں پر پوری طرح عیاں ہے۔

دوسری طرف میرا لڑکپن جماعت اسلامی کے کارکنوں کے اتباع میں بے سوچے سمجھے دیوانہ وار کام کرتے گذرا ہے اور دورِ طالب علمی اسلامی جمعیت طلبہ کی رفاقت میں۔ فکر کا تانا بانا مولانا مودودی مرحوم کی کتابوں اور جماعت کے اخبارات و جرائد کے مطالعہ سے بنا اور دوستیوں حتیٰ کہ رشتہ داریوں بلکہ ازدواج کی بنیاد بھی جماعت سے تعلق تھا۔ میرے قریبی عزیزوں میں جماعت کے متفقین تو لاتعداد ہیں، ارکین کی بھی کمی نہیں اور جماعت سے "ندا" کی "مشہور و معروف" مخاصمت کے باوجود میں اب بھی انہی لوگوں میں اٹھتا بیٹھتا اچھا لگتا ہوں۔ یہاں بھی ماضی اور حال کے درمیان کوئی ایسا ذاتی مسئلہ پیدا نہیں ہوا جو قربت کو دُوری میں بدلنے کا باعث بنتا۔ کسی طرح کی کوئی رقابت، کوئی چشمک، مفادات کا کوئی ٹکراؤ، کسی عہدے سے محرومی کا داغ، اللہ کے بندو! ایسی کوئی بھی تو بات نہیں۔ کم از کم میرے ساتھ ایسا کوئی حادثہ نہیں گذرا بلکہ الحمد للہ کہ دین سے دوری اور فکر میں کجی بھی پیدا نہ ہوئی جو بدقسمتی سے جماعت کے بہت سے سابق متفقین، ہمدردوں اور ارا کین میں پائی جاتی ہے۔ جماعت سے میرا فاصلہ اب یقیناً بہت بڑھ گیا اور اس کے بارے میں بات کرتے ہوئے میں جذبات کی رو میں بہہ جاتا ہوں، گفتگو میں خاصی زیادہ اور تحریر میں قدرے کم تلخی بھی در آتی ہے تو اس کی تین وجوہ ہیں، خالص ذاتی وجوہ۔ پہلی یہ کہ میں علم اور مشاہدے کی بنا پر جانتا ہوں کہ برصغیر ہند و پاک میں اسلام پر جو تجدیدی کام پچھلی چار صدیوں میں ہوا، اسے بڑی ہی عمدگی سے اور خداداد بصیرت کو استعمال کرتے ہوئے مولانا مودودی مرحوم و مغفور نے جدید ذہن کے لئے مرتب کیا اور اقامت دین کا ایک ایسا جامع، ہمہ گیر اور انقلابی تصور پیش کیا جو موجودہ زمانے میں تقریباً متروک ہو چکا تھا اور آج بھی ہماری مسلمان آبادی کی اس عظیم اکثریت میں موجود نہیں جو مولانا مرحوم کے فکر سے ناآشنا ہے یا جماعت اسلامی کے نزدیک نہیں آئی۔ محدود مذہبی تصورات رکھنے والوں کے اس ہجوم میں ہمیں وہ لوگ صرف جماعت اسلامی کے آس پاس ہی نظر آتے ہیں جو فرائض دینی کا جامع مفہوم سمجھتے، ان میں ترجیح کی ترتیب کا شعور رکھتے اور ان کی حسبِ مرتبہ و مقام ادائیگی کی ضرورت کو جانتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتنی بڑی توفیق کی ارزانی کے بعد یہی لوگ اگر اُلٹی زقندیں بھرنے لگیں تو یہ دیکھ کر میں درد سے بلبلا اٹھتا ہوں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ میں نے قیامِ پاکستان کے بعد پانچ چھ سال تک جماعت اسلامی کے نزدیک رہ کر اس کے ذمہ داروں اور ارا کین کی دین کے ساتھ نظریاتی اور عملی وابستگی، حقیقت پسندی اور اقامتِ دین کے مشن پر تن من دھن وار دینے کے جذبے کو

چشم خود دیکھا ہے اور یہ اس وقت کی بات ہے جب جماعت کی قیادت ایک اجتہادی غلطی کر کے خلوص کے ساتھ اپنے مضبوط اور منطقی موقف کو چھوڑ کر اس خام خیالی کا شکار ہو چکی تھی کہ چونکہ یہاں کے نو سو ننانوے فی ہزار باشندے اسلام کے شیدائی ہیں لہٰذا پاکستان میں فوراً اسلامی نظام کا نفاذ ہونا چاہئے اور چونکہ اس وقت کی قیادت ایک اسلامی ریاست کو چلانے کی اہل نہیں لہٰذا اسے اس منصب سے از خود ہٹ جانا چاہئے اور نہ ہٹے تو اٹھا کر پھینک دی جائے۔ میرے لئے یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ اپنے دور اول میں یعنی قیام پاکستان سے قبل جماعت نے عزیمت کے کیسے کیسے پہاڑ کھڑے کر دیئے تھے۔ میرے اُس گئے گذرے زمانے میں بھی کھنڈر گواہ تھے کہ عمارت عظیم تھی۔ ان لوگوں کا موازنہ جماعت کی موجودہ قیادت اور اس کے وابستگان کی عظیم اکثریت سے کرتا ہوں تو مایوسی کی اتھاہ گہرائی میں اُتر جاتا ہوں۔

تیسری اور آخری وجہ یہ کہ تنظیم اسلامی کے ساتھ کام کرتے ہوئے آئے دن اس تجربہ سے گذرنا پڑتا ہے کہ فرائضِ دین کا جامع تصور لوگوں کے ذہنوں میں بٹھانا کتنا مشکل ہو گیا' اس کے تقاضوں پر پورا اُترنے والوں کی تلاش کیسی عرق ریزی کی طالب ہے اور جو لوگ میسر آجائیں انہیں متحرک کرنا اور مستعد رکھنا اب خالہ جی کا گھر نہیں رہا۔ قوم بحیثیت مجموعی انحطاط کے ایک مسلسل اور تیزی پکڑتے عمل کا شکار ہے اور مردانِ کار کو جمع کرنا روز بروز مشکل تر ہوتا جا رہا ہے۔ ایسے میں جب یہ سوچتا ہوں کہ بھلے وقتوں میں جماعت اسلامی کو انسانوں کا جو قیمتی ذخیرہ مل گیا تھا' اس کا پست و بے فیض سیاسی جھمیلوں میں پڑ کر دیوالیہ نکال دیا گیا تو سینے پر سانپ لوٹتے ہیں۔ جماعت اسلامی کے لئے میرے جذبات کی شدت کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے ان تین وجوہ کو ایک اور عامل سے ضرب دے لیا جائے جو یہ ہے کہ اپنی تمام تر کمزوریوں اور کوتاہیوں کے باوجود میں خود آج بھی گر تا پڑتا اسی راہ پر چل کر آبلہ پائی سے محظوظ ہو رہا ہوں جس کی نشان دہی مولانا مودودی نے جماعت کی تشکیل کے وقت کی تھی۔ اگر کنارے بیٹھ کر صرف کمنٹری کر رہا ہوتا تو میں بھی نہایت شائستہ لہجے میں بڑی ہی خوبصورت باتیں کرتا۔ میرے منہ سے بھی پھول جھڑ سکتے تھے۔

ایک آخری وضاحت کے بعد اپنے خیر اندیش دوستوں کے اٹھائے ہوئے ممکنی نکات کی طرف آؤں گا۔ جمہوریت یا پارلیمانی نظام حکومت میرے لئے ہرگز دین و ایمان کا مسئلہ نہیں۔ میرے من کی مراد تو یہ ہے کہ اسلام کے نام پر حاصل کئے جانے والے دنیا کے اس واحد ملک میں اسلام کا تصور حریت و مساوات انسانی اور ہمہ جہت نظام عدل اجتماعی عملاً برپا ہوتا کہ بھٹکتی اور سر پٹکتی انسانیت کو فلاح کی وہ راہ نظر آنے لگے جس تک رہنمائی ختم نبوت کے بعد امتِ مسلمہ کا فرض عین ہے۔ بظاہر احوال ہماری یہ امید پاکستان سے وابستہ ہے ورنہ اللہ تو جس خطہ اور جس قوم کو چاہے' اس کام کے لئے منتخب کر سکتا ہے۔ اور پاکستان کی وحدت اور سلامتی ہماری تدبیر کی پے در پے غلطیوں کے باعث جمہوریت اور صحت مند سیاسی عمل کی روانی سے مشروط ہو کر رہ گئی ہے۔ پھر میرے نزدیک ایک مقید و پابند جمہوریت پاکستان میں اسلامی انقلاب کا راستہ نہیں روکتی اور ایسا مزاج بھی پیدا نہیں کرتی جو اسلام کے اس طرزِ حکومت کے آڑے آئے جو ٹھیٹھ دینی اصولوں کے تحت دورِ جدید میں تشکیل دیا جائے گا۔ ہمارے ملک میں جس جمہوریت کی بات چل رہی ہے وہ بحمد اللہ کم از کم نظری طور پر اللہ کی حاکمیت علیا کے سائے

میں انسانوں کی نیابت کے تصور پر مبنی ہے' مادر پدر آزاد نہیں۔

اب ترتیبِ معکوس میں رئیس اللہ شمس صاحب نوٹ فرمالیں کہ جماعت اسلامی اب منکرات کو ہاتھ سے ختم کرنے کا کام ہر گز نہیں کر رہی بلکہ ان کو فروغ کا موقعہ دے کر انہیں سیاسی کامیابیوں کے لئے عوام کی توجہ حاصل کرنے کے نعروں کے طور پر استعمال کر رہی ہے۔ پاکستان میں قادیانیوں کو اقلیت قرار دلوانے میں جماعت کا کوئی حصہ نہیں۔ اس نے تو علماء کی تحریک کے دباؤ میں آ کر مجبوراً اپنے مطالبۂ دستورِ اسلامی میں بہت بعد جا کر اسے ایک آخری نکتہ کے طور پر شامل کیا تھا۔ دین و سیاست کی علیحدگی کا تصور ختم کر کے یقیناً اس نے ایک عظیم کام کیا تاہم علماء و مشائخ کو مروجہ سیاست کے میدان میں لا کر جماعت اسلامی نے انہیں دین کا چھوڑا نہ دنیا کا۔ دوامِ اقتدار کے بارے میں ان کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی' ہاں حصولِ اقتدار کا ذریعہ اس نے اسلام کے (محض) نام کو ضرور بنا رکھا ہے۔ یہ بنیادی (؟) کام جماعت کی تبلیغِ دین کو نقصان پہنچا رہا ہے اور آخری تلخ حقیقت یہ ہے کہ دینی' اصلاحی اور مثبت تحریکوں کے ساتھ جماعت میں کبھی ہم آہنگی پیدا نہ ہوئی۔ دینی و اصلاحی کاموں میں علمائے کرام اور دینی مدارس کے کردار اور مثبت تحریکوں میں آزادی کی جدوجہد کی اہمیت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ جماعت اسلامی ان سب کی بوجوہ حریف تھی۔ ایسے کسی بھی کام کے لئے اس نے دستِ تعاون ہمیشہ کو تار تار کھا' دراز کیا تو محض وقتی سیاسی اتحادوں کی طرف جن کا مقصدِ وحید بلا استثناء صاحبِ اقتدار کی ٹانگ کھینچنا رہا۔

اپنے مہربان دوست محمد صادق کھوکھر صاحب سے گذارش ہے کہ "ندا" حسبِ موقع اسلام کی انقلابی دعوت ہی پیش کر تا رہا ہے لیکن چونکہ یہ ایک سیاسی جریدہ بھی ہے' خالص دعوتی رسالہ نہیں لہٰذا نسبت و تناسب کا خیال رکھنا شاید ضروری تھا۔ جماعت اسلامی پر تنقید اس لئے کی جاتی رہی کہ اگرچہ اسلام کی انقلابی دعوت جو تنظیم اسلامی پیش کر رہی ہے وہ دراصل جماعت ہی کی دعوت تھی لیکن اب اس نے دودھ میں مینگنیاں ڈالنی شروع کر دی ہیں تو ہمارے لئے یہ بتانا ضروری ہو جاتا ہے کہ اپنی اصل دعوت اور اصل کام سے جماعت نے انحراف کا راستہ کب اور کیسے اختیار کیا۔ یہ خیر پسندیدہ کام کرنا اس لئے بھی مفید ہے کہ خود ہماری ابتدائی مراحل طے کرتی تحریک اسی قسم کے کسی فریب کا شکار نہ ہو جائے جس سے جماعت کی تحریکِ اسلامی دوچار ہوئی۔ ہم اس طرح فی الحقیقت تجدید و احیائے دین کے لئے مستقبل میں اٹھنے والی تحریکوں کی بیشگی خدمت بھی انجام دے رہے ہیں کہ وہ اوّلین اسلامی تحریکوں کے انجام سے محض عبرت نہ پکڑیں بلکہ ان کی غلطیوں سے سبق بھی سیکھ سکیں۔ اسلام پر کسی کا اجارہ نہیں' تاقیامِ قیامت انسان اپنی جنتِ گم گشتہ کی تلاش میں سرگرداں رہے گا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے موعود مکمل غلبۂ اسلام تک اسلامی تحریکیں یہاں وہاں اٹھتی رہیں گی۔ جماعت اسلامی سے امیدیں باندھنا اور نصیحتیں کرنا فضول نہیں' امید اس لئے ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی بھی وقت اسے اپنے اصل کام کی طرف لوٹنے کی توفیق دے سکتے ہیں۔ جس مشن پر اس وقت نسیان کا پردہ پڑا ہوا ہے' وہ اس کے قلب و ذہن میں مستور تو ہے جس کی یاد دلائی جاتی ہے اور نصیحت کی ہمیں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت فرمائی ہے۔ یہ بھی یاد رکھئے کہ نصیحت کبھی پسند نہیں کی جاتی لیکن اس نامقبولیت کے باعث ہمارا فرض تو ساقط نہیں

ہو جاتا۔ تنظیم اسلامی نے جلد یا بدیر انقلاب لانے کا کوئی فن ایجاد نہیں کیا' سیرتِ مطہرہ سے اخذ کیا ہے اور دین کے کام کے نہج کا ادراک رکھنے والے ہر شخص کو صلائے عام ہے کہ ہم سے اسے سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے تو واضح کرے۔ ویسے بھی ہم بالفعل انقلاب لانے کے مکلف نہیں' صحیح سمت میں کام کرتے چلے جانے پر مامور ہیں اور امیدیں دوسروں سے کم' جماعت اسلامی سے زیادہ باندھتے ہیں جو ہماری زبان سمجھنے والا واحد گروہ ہے۔

اور پیارے بھائی محمد اشرف کو اپنی جن باتوں کا جواب میری اب تک کی گذارشات میں نہیں ملا' ان کے بارے میں انشاء اللہ اگلے ہی شمارے میں عرض کروں گا کیونکہ بات پہلے ہی بہت لمبی ہو گئی۔ ویسے بھی اس تحریر میں تو ابتداء ہوئی ہے۔ میری ایک ایک گذارش پر بحث کا الگ الگ دروازہ کھولا جاسکتا ہے اور یہ بعض قارئین کی دلچسپی کے باعث چھڑ گئیں تو انشاء اللہ نتیجہ مفید ہی نکلے گا البتہ اشتہاروں کا ذکر کر کے انہوں نے "اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے"۔ یہ بعد میں بتاؤں گا کہ اشتہار کب' کیسے اور کس بھاؤ ملنے شروع ہوئے لیکن شاید انہوں نے غور سے دیکھا نہیں۔ اشتہارات کی اکثریت میاں نواز شریف کی پنجاب حکومت سے ملی ہے اور پیپلز پارٹی کی وفاقی حکومت نے پورے اہتمام سے ہاتھ کھینچ کر رکھا۔ دو سال پہلے "ندا" کا ڈیکلریشن بھی میاں صاحب کی ذاتی مہربانی سے ملا تھا جس کے لئے میں ان کا ممنون احسان ہوں۔ اس زمانے میں ڈیکلریشن کا حصول "لانا تھا جوئے شیر کا" جواب نکلے سیر بکتے ہیں۔

سو اب یہ بتانا اگلی صحبت پر موقوف ہوا کہ نہ مجھے جماعت اسلامی' آئی جے آئی اور میاں نواز شریف سے کوئی بغض و عناد ہے نہ پی پی پی اور بے نظیر بھٹو سے کوئی فکری مطابقت اور قلبی لگاؤ۔ میری تلخ نوائی یا پیپلز پارٹی کا ذکر کرنے میں نہ کسی محرومی کا دکھ ہے نہ کسی منفعت کی توقع۔ غم ہے تو اصولوں کے جھٹکے کا' رنج ہے تو موقع پرستوں کے ہاتھوں اسلام کی مٹی پلید ہونے کا اور فکر ہے تو پاکستان میں سیاست کی بے راہ روی کا۔ اللہ کا احسان ہے کہ چھوٹی موٹی بے اعتدالیوں کے سوا (جن کے لئے میں عفو و درگذر کا طالب ہوں' اللہ سے اور اپنے قارئین سے بھی) مجھے اپنی اس مختصر صحافتی زندگی میں اب تک کوئی پچھتاوا لاحق نہیں اور "ہر داغ ہے اس دل میں بجز داغِ ندامت"۔○○

ہفت روزہ "ندا" میں

■ امیر تنظیم اسلامی کے حالیہ دورۂ بھارت کے تاثرات ۲۱ر نومبر ۱۹۸۹ء کے شمارے میں ——— اور

■ مرکزیہ مجلس اقبال کے جلسے میں امیر تنظیم اسلامی کے حالیہ خطاب کی تلخیص ۲۸ر نومبر کے شمارے میں ملاحظہ فرمائیں۔

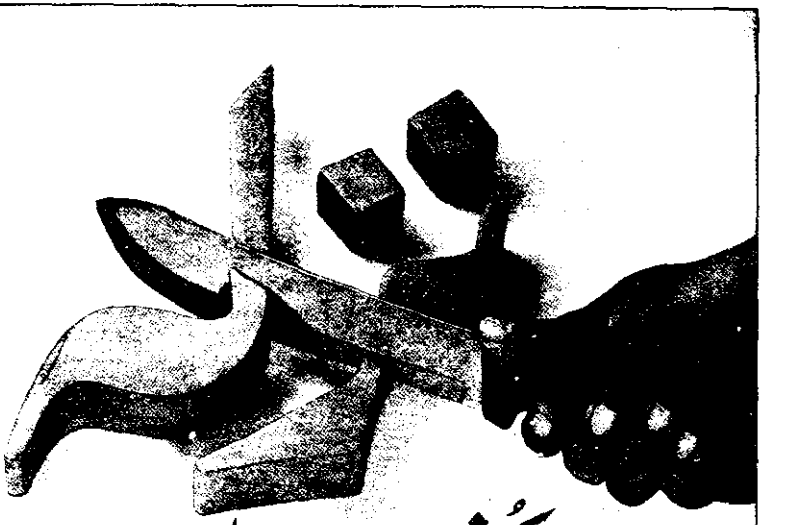

نزلہ کُشتن روزِ اوّل

گلے میں خراش محسوس ہو یا چھینکیں آنا شروع ہوں تو سمجھ لیجیے کہ نزلہ زکام کی آمد آمد ہے۔ اسے معمولی بیماری سمجھ کر نظر انداز نہ کیجیے۔ فوری جوشینا لیجیے ورنہ زکام، کھانسی اور بخار جیسے تکلیف دہ امراض لاحق ہونے کا اندیشہ ہے۔

جوشینا۔ صدیوں سے استعمال ہونے والے جوشاندے کے نہایت مؤثر، کافی و شافی قدرتی اجزا کا خُلاصہ (ایکسٹریکٹ) ہے جو ہمدرد کے ماہرینِ فن نے سال ہا سال کے تجربات و تحقیق کے بعد جدید دور کے معروف انسان کے لیے تیار کیا ہے تاکہ اسے جوشاندے کو ابالنے، چھاننے اور شکر ملانے کی زحمت نہ کرنی پڑے۔ ایک پیکٹ جوشینا ایک کپ گرم پانی میں ڈالیے فوری استعمال کے لیے جوشاندے کی ایک خوراک تیار ہے۔

ہمدرد کی فنی محنت اور دوا سازی کی صلاحیت کا مظہر

جوشاندے کی مکمل توانائی | **جوشینا**

نزلہ و زکام۔ جوشینا سے آرام

ہمدرد

جوشینا دو پیکنگوں میں دستیاب ہے
خوب صورت پلاسٹک مگ
میں اور گتے کے کارٹن میں۔

آدابِ اخلاق
عفو و درگذر
بہترین انتقام

کیا احیاءِ اسلام کا خواب
نومسلم اقوام کے ہاتھوں ہی شرمندۂ تعبیر ہوگا؟

الطاف محمود صاحب کا سوال اور امیر تنظیم اسلامی کا مفصل جواب

مرتب: حافظ خالد محمود خضر

محترمی ڈاکٹر صاحب!

السلام علیکم!

آپ کے پچھلے دو جمعوں کے خطبات باقاعدگی سے سُنے ہیں۔ اس سے پہلے تنظیم اسلامی سے تعارف کی حد تک معلومات تھیں۔ کبھی کبھار تنظیم اسلامی کی مطبوعات سرسری نظر سے دیکھ لیتا ہوں یہ جاننے کے لئے کہ آپ کا راستہ کیا ہے۔

میں بنیادی طور پر تاریخ اسلام کا طالب علم ہوں۔ تاریخ اور حالاتِ حاضرہ کو سامنے رکھتے ہوئے عالم اسلام کے مستقبل پر اکثر غور و فکر کرتا رہتا ہوں۔ چونکہ آپ انقلابِ اسلامی کے علمبردار ہیں لہٰذا اپنے چند خیالات آپ تک پہنچانا چاہتا ہوں۔

میرے خیال میں مستقبل عالم اسلام کی شان و شوکت کا ہے۔ اکیسویں صدی مسلمانوں کے عروج کی صدی ہوگی۔ یا ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ عالم اسلام کے عروج کا ابتدائی دَور ہوگا۔ اپنی تاریخ میں ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ ہمیشہ نومسلم اقوام ہی عالم اسلام کے احیاء کا ہراول ثابت ہوئی ہیں۔ موجودہ دَور میں نیگرو نسل ہر محاذ پر جدّوجہد کر رہی ہے۔ ان میں افریقہ کی اقوام ہوں یا امریکہ اور یورپ میں آباد کالی رنگت والے۔ اور مجھے یقین ہے کہ یہ لوگ مستقبل میں عروج حاصل کریں گے۔ کیونکہ ہمیں صرف قدیم اقوام کی تاریخ میں کالی رنگت والی اقوام کے عروج کا ذکر ملتا ہے، اس کے بعد یہ ہمیشہ کچلے جاتے رہے ہیں۔ اگر ان میں زیادہ سے زیادہ اسلام کی تبلیغ کی جائے (جو کہ ہو رہی ہے) اور ساتھ ہی انسانیت اور خاص کر عالم اسلام کی قیادت کی دعوت

وترغیب دی جائے تو یہ لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہوں گے ۔ اور آئندہ آنے والے دور میں احیائے اسلام کا موجب بنیں گے ۔

یہی طریق کار ہم ہندمیں استعمال کر سکتے ہیں ۔ ہندوستان کے ہریجن جو ہمیشہ اچھوت رہے اور کچلے جاتے رہے ہیں، انہیں پورے جنوبی ایشیا اور اس سے باہر کی دنیا کی قیادت کی پیش کش کر کے دعوت اسلام دی جائے تو بھارت کے کروڑوں ہندو ہریجن اسلام کی طرف آ سکتے ہیں ۔ مشرق بعید میں بھی یہی کام کیا جا سکتا ہے ۔

دوسری طرف یورپ اور یورپی اقوام ہیں ۔ یورپ پر مسلمانوں کا پہلا حملہ مغرب کی طرف سے ہوا اور مسلمانوں نے اسپین اور جنوبی فرانس فتح کیا ۔ مسلمانوں کا یہ حملہ وسطی یورپ میں روک لیا گیا اور انہیں آگے بڑھنے نہیں دیا گیا ۔ پھر مسلمانوں کو پیچھے دھکیلتے ہوئے آٹھ سو سال کے عرصے میں یورپ سے باہر نکال دیا گیا ۔

اب یورپ نے مسلمانوں پر حملہ کیا اور صلیبی جنگیں ہوئیں جو قریباً اسی نوے سال جاری رہیں ۔ دوسری بار مسلمان مشرق سے حملہ آور ہوئے ۔ اس حملے کو بھی وسطی یورپ ہی نے روکا ۔ مسلمانوں کو پھر پیچھے دھکیلا گیا اور چھ سو سال کے عرصے میں یورپ نے تمام عالم اسلام پر قبضہ کر لیا ۔ پھر عالم اسلام میں آزادی کی تحریکیں اٹھیں جن کے نتیجے میں مسلمان یورپ کی محکومی سے آزاد ہوئے ۔

اب مسلمان وسطی یورپ (فرانس، برطانیہ، جرمنی، ہالینڈ وغیرہ) میں لاکھوں کی تعداد میں پہنچ چکے ہیں ۔ مغرب یورپ میں عیسائیت دم توڑ چکی ہے اور اس کی لاش پڑی ہے، جبکہ مشرقی یورپ میں کمیونزم کے ردعمل کے طور پر عیسائیت کچھ زندہ ہے ۔ اس کی مثال آج کا پولینڈ ہے یا پھر مشرقی جرمنی جہاں سے عیسائیت کو پسند کرنے والے لوگ نکل رہے ہیں ۔

مسلمانوں کو چاہیئے کہ وسطی یورپ کو مرکز بنا کر مشرق اور مغرب دونوں اطراف کو پھیلیں اور ایشیا و افریقہ کی طرف آئیں ۔ یہ ایک LONG TERM PLANNING ہوگی ۔ یعنی یہ صدیوں کا عمل ہوگا، چند برسوں کا نہیں ۔ آج کے دور میں تبلیغ انتہائی آسان ہے، خاص طور سے یورپ اور امریکہ میں ۔ یورپ کے مروجہ قوانین اور بین الاقوامی

قانون تبلیغ کے لیے انتہائی سازگار ہیں۔ اس سے پہلے مسلم اقوام یورپ میں فاتح کی صورت میں داخل ہوئی ہیں اور تبلیغ کی حیثیت ثانوی رہی ہے۔ یعنی پہلے فاتحین پہنچتے تھے اور ان کے پیچھے مبلغین آتے تھے، جس کی وجہ سے تبلیغ کا اثر کم ہوتا رہا ہے۔ لیکن اب فاتحین کی ضرورت نہیں ہے اور مبلغین یورپ میں پہنچے ہوئے ہیں۔ انہیں زیادہ سے زیادہ منظم کرنے اور اس کام کو ایک مرکز بنا کر کرنے کی ضرورت ہے۔

اسلام کی اس تبلیغ کے خلاف یورپ میں ردّعمل بھی ہو سکتا ہے۔ امریکہ میں چونکہ یہودی چھائے ہوئے ہیں لہٰذا وہ اسے قطعاً برداشت نہیں کریں گے اور وہ پریس اور میڈیا کو اس کے خلاف استعمال کر سکتے ہیں۔ امریکہ میں ہونے والے ردّعمل کو امریکہ ہی میں روکنے کے لئے یہاں الگ مراکز قائم کیے جائیں جو ایسی کوششوں کا توڑ وہیں پر کر سکیں۔

خیر اندیش

الطاف محمود۔ ایم اے (ہسٹری) سید ہاسٹل۔ لاہور

میرا خیال ہے کہ آپ کی بہت سی باتیں تو میری گذارشات کے مطابق ہی ہیں۔ البتہ آخر میں آپ نے جو بات کی ہے اس میں اور جو بات آپ نے ابتدا میں کہی ہے اس میں تھوڑی سی تضاد کی کیفیت ہے۔ یعنی آپ کے نزدیک تبلیغ کا عمل صدیوں پر محیط ہو گا، جبکہ آپ کہہ رہے ہیں کہ اکیسویں صدی غلبۂ اسلام کی صدی ہو گی اور میرے خیال میں آپ کی پہلی بات صحیح ہے۔ میں نے بھی اپنی تقریر میں جو بات کہی ہے وہ قریباً یہی ہے۔ اگرچہ میں نے غلبۂ اسلام اور عالمی غلبۂ اسلام کو مستقبل بعید سے متعلق قرار دیا ہے، لیکن اپنی گفتگو میں میں نے بار بار یہ کہا تھا کہ یہ بعید زیادہ بعید نہیں ہے۔ اس میں کوئی لمبی بات نظر نہیں آتی۔ ہمارا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ ہم فوری طور پر جو حالات ہیں ان سے بہت زیادہ متاثر ہو جاتے ہیں، جبکہ اللہ کی تقویم ذرا طویل ہے۔ ہمارا حساب چھوٹا ہوتا ہے، ہم دس بیس سال کو بہت بڑی اہمیت دیتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کے حساب میں ایک دن جو ہے وہ ہزار برس کا ہے۔ اس اعتبار سے اللہ کی تقویم میں تو وہ بہت ہی قریب ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے سورۃ المعارج کی آیت ہے: إِنَّهُمْ يَرَوْنَهُ بَعِيدًا وَنَرَاهُ قَرِيبًا ۔ "یہ اسے دور دیکھ رہے ہیں اور ہم اسے قریب دیکھ رہے ہیں۔" تو اللہ تعالیٰ کا جو علم ہے وہ لامحدود ہے اور البصیر ہونے کے اعتبار سے اس کی بصارت لامتناہی ہے۔ تو میرا بھی اندازہ یہ ہے کہ یہ غلبۂ اسلام،

کا معاملہ اب زیادہ دور نہیں ہے۔ میں بیان کر چکا ہوں کہ اس کی بڑے واضح الفاظ میں خبر دی ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے۔ اور یہ منطقی نتیجہ ہے قرآن کریم کے دو مضامین کا۔ یعنی (۱) حضورؐ کی بعثت ہوئی ہے غلبۂ دین کے لئے اور (۲) حضورؐ کی بعثت ہوئی ہے پوری نوعِ انسانی کے لئے۔ ان صغریٰ کبریٰ کو جوڑ دیا جائے تو اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ پورے عالمِ انسانی پر اسلام کا غلبہ ہو کر رہے گا۔

آپ کی یہ بات کہ نو مسلم اقوام نے زیادہ کام کیا ہے، بہت صحیح ہے اور یہی بات میں نے اپنی کل کی تقریر کے شروع میں کہی تھی کہ بنی اسرائیل میں تو ہمیں یہ معاملہ نظر آتا ہے کہ ان کے ہاں پہلے زوال کے بعد جو احیاء ہوا وہ بنی اسرائیل ہی میں ہوا لیکن مسلمانوں میں جو ایک مرتبہ کے زوال کے بعد احیاء ہوا اور دوسرے عروج کا معاملہ آیا، وہ عربوں کی زیرِ قیادت نہیں تھا بلکہ ترکوں کی زیرِ قیادت تھا۔ اور میں نے کل جمعہ میں یہ عرض کیا تھا کہ کوئی عجب نہیں کہ یہی چیز دوبارہ دہرائی جائے ؎

ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مِل گئے کعبے کو صنم خانے سے

اس میں کوئی چیز بعید از قیاس نہیں ہے۔ اور واقعہ یہی ہے کہ کسی بگڑی ہوئی مسلمان قوم کو سنوارنا کسی نئی قوم کو مسلمان کرنے سے ہزار گنا زیادہ مشکل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو اپنی تمام تر مساعی کے باوجود اور نو عظیم معجزات دکھانے کے باوجود اس پر آمادہ نہیں کر سکے کہ وہ جنگ کے لئے جان ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں آئیں۔ وہ ایک بگڑی ہوئی مسلمان قوم تھی۔ ایک ایسی نسل تھی جو اگرچہ مسلمان تھی لیکن زوال سے آشنا ہو چکی تھی۔ ان میں دوبارہ زندگی پیدا کرنے کے لئے تین سو برس لگے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر کی معیت بھی ان میں جان پیدا نہ کر سکی کہ جن کا ذکر قرآن مجید میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کے بعد سب سے زیادہ ہوا ہے۔ جہاں تک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق ہے، ہم سمجھتے ہیں کہ پورا قرآن ہی آپ کی سیرت ہے، ورنہ نام لے کر جو ذکر قرآن میں ہوا ہے وہ سب سے زیادہ حضرت موسیٰؑ کا ہوا ہے۔ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے "قصص القرآن" میں شمار کیا ہے کہ قرآن مجید کی پانچ سو پچپن آیات حضرت موسیٰؑ علیہ السلام کے ذکر پر مشتمل ہیں۔ یعنی قرآن کا تیرھواں حصہ حضرت موسیٰؑ کے ذکر پر مشتمل ہے۔ انہیں اس قوم نے کورا جواب دے دیا: اذْهَبْ

اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا اِنَّا هٰهُنَا قَاعِدُوْنَ ۔ یعنی اے موسیٰ جاؤ تم اور تمہارا رب جا کر لڑو، ہم تو یہاں بیٹھے ہیں۔ اس پر پھر انہیں چالیس برس کی سزا ملی ہے۔ ان کی نئی نسل صحرا کے اندر پیدا ہوئی اور یہیں پروان چڑھی۔ اس نے کچھ ہمت کا ثبوت دیا اور فلسطین کو فتح کیا۔ پھر بھی ان کے اندر آپس میں اس قدر ناچاقی تھی کہ بارہ قبیلوں نے اپنے علیحدہ علیحدہ علاقے بنا لیے اور کوئی مرکزی حکومت قائم نہیں ہو سکی۔ کبھی کوئی طاقت ان کے کسی ایک قبیلے پر تاخت کر جاتی، کبھی کوئی دشمن ان کے کسی دوسرے قبیلے کو مار جاتا تھا۔ تین سو برس بعد حضرت یوشع بن نون کے زمانے میں انہوں نے یکمشت ہو کر حضرت طالوت کے زیر قیادت جہاد کیا جس کے نتیجے میں ان کی مرکزی حکومت قائم ہوئی اور ان کا "خلافتِ راشدہ" کا دور شروع ہوا ـــــ تو اس میں کوئی عجب نہیں، اللہ کی قدرت سے کچھ بعید نہیں، ہمیں اس میں مایوس نہیں ہونا چاہیئے، اس لئے کہ پاکستان کا معاملہ جیسا کہ میں 'استحکامِ پاکستان' میں وضاحت سے لکھ چکا ہوں ہوں کہ مجھے نظر آتا ہے کہ شاید یہیں سے غلبۂ اسلام کا آغاز ہوگا۔ واللہ اعلم! ہم صرف اشارات ہی سمجھ سکتے ہیں اور ان کے سمجھنے میں ہم سے غلطی بھی ہو سکتی ہے۔ لہٰذا ہم کوئی بات یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے۔ بہرحال عالم اسلام میں اگر کہیں سے کوئی امکان ہے تو وہ صرف پاکستان ہے۔

یہ بات جو آپ نے کہی ہے کہ یورپ میں اس وقت تبلیغ کی اجازت ہے اور مغربی جمہوری نظام نے ہمیں سہولت بہم پہنچائی ہے کہ ہم اپنے نظریات و خیالات وہاں عام کر سکیں ـــــ تو میں کل جمعہ میں بھی عرض کر چکا ہوں کہ یہ صورت عالم اسلام میں جتنی پاکستان میں ہے، اور کہیں نہیں! کام کرنے کی جتنی آزادی آپ کو یہاں میسّر ہے، اور کہیں نہیں یہ دوسری بات ہے کہ ہم کام کرنے کے لئے اور قربانی دینے کے لئے تیار نہ ہوں۔ اگر آپ عالم اسلام کے دیگر ممالک سے تقابل کریں تو اندازہ ہو کہ یہاں کام کرنے کی کتنی آزادی ہے۔ شام میں دعوت و تبلیغ پر سخت پابندیاں ہیں۔ اور توبہ توبہ ـــــ لیبیا کا حال تو اس وقت یہ ہے کہ مسلمان بے چارے مسجد میں نماز نہیں پڑھ سکتے۔ اگر ایک مسجد میں کوئی شخص پیہم نماز پڑھتا ہو تو سی آئی ڈی میں اس کا اندراج ہو جاتا ہے کہ یہ بہت خطرناک آدمی ہے۔ لہٰذا جو لوگ باجماعت نماز ادا کرنا چاہتے ہیں وہ یہ کوشش کرتے ہیں کہ ایک نماز کسی ایک مسجد میں پڑھیں تو دوسری کسی اور مسجد میں اور تیسری کسی اور مسجد میں جا کر ادا کریں، تاکہ ان کا اندراج کہیں مستقل نمازیوں میں نہ ہو جائے۔ اس لئے کہ حکومت اس کے اندر بھی ایک مخفی خطرہ محسوس

کرتی ہے ۔ پاکستان میں دعوت کا کام کرنے کی میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے ۔

بہرحال اس میں کوئی شک نہیں، جیسا کہ میں نے کل بھی کہا، کہ ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بالکل کسی نئی قوم کو قبول فرمالے ۔ آپ نے جو بات "نیگروز" کے بارے میں کہی ہے وہ میرے لئے یقیناً ایک نئی بات ہے اور قابلِ غور ہے ۔ یہ درست ہے کہ گذشتہ دور میں تاریخ کے اندر اُن کا بڑا رول رہا ہے، چنانچہ ایبے سینیا اور حبشہ کی حکومتیں بڑی باحیثیت حکومتیں ہوا کرتی تھیں ۔ حضرت نجاشی کے معاملے سے بھی یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان حکومتوں کی ایک قوت ہوتی تھی اور یہ دنیا میں ایک مؤثر رول ادا کرتے تھے ۔۔۔ لیکن یہ جو زمانہ آیا ہے کہ افریقہ کے اندر آزادی کی لہر آئی اور " 3RD WORLD PHENOMENON " پوری دنیا میں جس طریقے سے ہوا ہے، افریقہ میں بھی ہوا، تو میرے لئے یہ معاملہ ابھی قابلِ غور ہے اور میں اس میں کوئی حتمی رائے قائم نہیں کرسکتا ۔ اس نئے دَور میں افریقہ میں کوئی خاص POWER POTENTIAL ترقی پا رہا ہو، یا جسے کہا جائے کہ صلاحیتوں کا اظہار ہو رہا ہے، یہ بات تاحال نظر نہیں آتی ۔ واللہ اعلم ۔ میرا مطالعہ اس مسئلے پر براہِ راست نہیں ہے ۔ لہٰذا میں اس پر کوئی تبصرہ نہیں کر رہا ۔

البتہ جہاں تک امریکہ کے نیگروز ہیں، ان کے بارے میں میرا مشاہدہ ہے ۔ وہاں صورت یہ ہوئی تھی کہ علیجا محمد جس نے یہ پوری تحریک وہاں پر شروع کی وہ تو ایک بہت ہی غلط قسم کا شخص تھا ۔ وہ اپنے آپ کو خدا کا اوتار بھی کہتا تھا، نبی بھی کہتا تھا ۔ اس نے 'اسلام'، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کو اپنے مفادات کے لئے استعمال کیا ۔ باقی اس کا اسلام کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا ۔ وہ جو اپنے مرکز بناتے تھے انہیں مسجد نہیں بلکہ 'MOHAMMADAN TEMPLES' کہتے تھے، جہاں کرسیاں رکھی ہوتی تھیں ۔ وہاں وہ نماز نہیں پڑھتے تھے، بلکہ وہاں وہ جمع ہوجاتے اور علیجا محمد ان کے سامنے بس تقریریں کرتا تھا ۔ اور تقریروں میں گوروں کا مذاق اڑانے، گوروں پر فقرے چست کرنے اور ان کو گالیاں دینے کے علاوہ اس کا اور کوئی کام نہ تھا ۔ اور جیسا کچھ وہ گوروں کا استہزاء کرتا اس پر تالیاں بجتیں ۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک انتقامی ساجذبہ تھا اور انہیں جس طرح سے امریکہ میں دبایا گیا تھا اور ان کو کچلا گیا تھا اس کا ردِعمل تھا ۔ اور امریکہ میں جو بدامنی بھی ہوتی ہے وہ زیادہ تر انہی کے ذریعے ہوتی ہے ۔ جن آبادیوں میں یہ لوگ موجود ہوں، وہاں گوروں کا راتوں کو باہر نکلنا بھی محفوظ نہیں ہے ۔ رات کو لوکل ٹرین کے SUBWAYS پیان کا قبضہ

ہو جاتا ہے اور نہ معلوم یہ وہاں کیا کیا کارروائیاں کرتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ درحقیقت بحیثیت قوم انتقام لے رہے ہیں اس ظلم کا جو وہاں ان کے آباء و اجداد پر گوروں نے کیا تھا۔ علیجا محمد کے بعد اس کی جماعت دو حصّوں میں منقسم ہو گئی تھی۔ ان میں سے ایک حصّے کی قیادت اس کے حقیقی بیٹے وارث دین محمد کے ہاتھ میں ہے جو بڑا صحیح العقیدہ اور صحیح الفکر مسلمان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علیجا محمد نے اسے عاق کر دیا تھا اور اپنی زندگی ہی میں اسے اپنے گروہ سے منقطع کر دیا تھا۔ اس کا اصل نام ولیس ڈی محمد تھا جسے اسے نے بدل لیا ہے۔

اس پر قادیانیوں نے بھی کافی ڈورے ڈالے۔ وہ یہاں ربوہ میں آکر رہا بھی ہے اور کچھ تعلیم بھی حاصل کی ہے۔ لیکن اس پر اللہ کا یہ بڑا فضل ہوا کہ حقیقت اس پر منکشف ہو گئی اور وہ قادیانی نہیں ہوا۔ پھر وہ عالم عرب میں بھی گیا۔ میری اس سے کئی سال پہلے ملاقات ہوئی تھی۔ سٹوٹی آئی لینڈ شکاگو میں جو ان کا بہت بڑا مرکز ہے، اس میں اس نے مجھے مدعو کیا تھا اور میں نے وہاں تقریر بھی کی تھی۔ ہمارے انگریزی کے جو پانچ کتابچے ہیں اس نے وہ بڑے پسند کئے تھے۔ وہ اصل میں اپنی اُس کمیونٹی کو منظم کر رہا ہے ـــــ ان کا دوسرا گروہ فراحان کے زیر قیادت ہے، جس کا نام آپ نے سنا ہو گا۔ یہ فراحان علی جا محمد ہی کی لائن پر ہے۔ سوائے اس کے کہ وہ اسلام کے نام پر لیبیا وغیرہ سے پیسے بٹور کر لے جاتا ہے، اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ بہت ہی شاطر اور چالاک آدمی ہے لیکن مسلمان نہیں ہے۔ جبکہ وارث دین محمد صحیح العقیدہ مسلمان ہے اور اسلام کی دعوت و اشاعت کا کام کر رہا ہے۔

مجھے اس دفعہ معلوم ہوا کہ وارث دین محمد ابھی تک صرف سیاہ فام مسلمانوں میں اپنی آرگنائزیشن کر رہا تھا جو AFRO-AMERICANS کہلاتے ہیں، لیکن اب وہ اتنے اعتماد میں آ گئے ہیں کہ اس مرتبہ ان کا جو کنونشن ہوا ہے اسے انہوں نے بالکل اوپن رکھا ہے کہ تارکین وطن مسلمان بھی اس میں شریک ہوں۔ وہاں دراصل عالم عرب اور ہند و پاکستان کے تارکین وطن اور مقامی سیاہ فام باشندوں میں اب تک کچھ کھچاؤ سا رہا ہے۔ یہ (تارکین وطن) سمجھتے تھے کہ ہم ان سے برتر ہیں، ہم عرب ہیں یا ہندوستانی و پاکستانی ہیں، ہم زیادہ پڑھے لکھے ہیں اور اسلام کو زیادہ جانتے ہیں۔ لہٰذا انہیں ہماری قیادت قبول کرنی چاہیئے۔ جبکہ وہ یہ کہتے تھے کہ ہم یہاں کے اصل ہیں، ہم امریکی ہیں، یہ تو اب آئے ہیں لہٰذا انہیں ہماری قیادت قبول کرنی چاہیئے۔ تو امریکہ میں تارکین وطن کا حلقہ علیحدہ چل رہا تھا اور وارث دین محمد کا حلقہ الگ کام

کر رہا تھا۔ ان کے درمیان کچھ کوششیں ہوتی بھی تھیں کہ عید کے موقع پر ہی مشترکہ اجتماع ہو جائے، لیکن ایسی کوششیں ابھی تک کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکی تھیں۔ سیاہ فام یہ اعتراض بھی کرتے تھے کہ تمہاری عورتیں بے پردہ آتی ہیں، ان کے لباس صحیح نہیں ہیں۔ سیاہ فام عورتیں اگرچہ چہرے کا پردہ نہیں کرتیں لیکن ان کا لباس ساتر ہوتا ہے جبکہ آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے ہندوپاکستان اور عالم عرب کی بہت سی خواتین کے لباس ساتر نہیں ہوتے، بلکہ عید بقرعید پر تو معلوم ہوتا ہے کہ شاید کوئی فینسی ڈریس شو یا ڈریس پریڈ ہو رہی ہے۔ اس مرتبہ میں نے اسنا (ISNA) کنونشن میں محسوس کیا کہ اس اعتبار سے حالت کچھ بہتر ہوئی ہے بہرحال اس مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ جب اسنا کی کنونشن ہو رہی تھی تو اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ ان سیاہ فام مسلمانوں کی بھی کنونشن ہو رہی ہے جسے انہوں نے سب کے لئے کھلا رکھا ہوا ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ ایک اچھی بڑی طاقت ہے جو وہاں منظم ہو رہی ہے۔ اور ان میں ظاہر بات ہے کہ کوئی احساس کمتری نہیں ہے۔ وہ اپنے آپ کو مکمل امریکی شہری سمجھتے ہیں۔ قانونی اور دستوری طور پر تو ظاہر بات ہے کہ وہاں کوئی نسلی امتیاز نہیں ہے، امتیاز جو بھی ہے وہ دلوں ہی ہے۔ بہرحال امریکہ میں میں ان دونوں حلقوں کے اندر کچھ آثار دیکھ رہا ہوں جسے میں نے تعبیر کیا تھا کہ کچھ عجب نہیں کہ شاید اللہ تعالیٰ فرعون کے گھر میں موسیٰ کی پرورش کروائے۔ واللہ اعلم! اللہ کی قدرت سے یہ بعید نہیں ہے۔

ہند کے بارے میں آپ نے جو کچھ کہا مجھے اس میں تھوڑا سا اختلاف ہے۔ اصل میں یہ ہماری غلط فہمی ہے کہ ہم جب بھی ہند میں تبلیغ کے بارے میں سوچتے ہیں تو ہماری نگاہ ہریجنوں پر ہی جاتی ہے۔ یہ بات درحقیقت اسلام کے فلسفے کے خلاف ہے۔ اسلام کی تبلیغ عیسائیت کی تبلیغ کے مانند نہیں ہے۔ عیسائیت کا تو کوئی نظام نہیں ہے۔ نہ اس کا کوئی فلسفہ اور حکمت ہے اور نہ کوئی معقول عقائد ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ عیسائیت کے جو کچھ بھی عقائد ہیں غیر منطقی اور غیر معقول ہیں۔ اسی لئے وہ "DOGMA" کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ تو چونکہ ان کے پاس نہ کوئی پیغام ہے جو معقول ہو، نہ کوئی فلسفہ و حکمت ہے جو عقل کی میزان پر پوری اترتی ہو اور نہ کوئی نظام ہے جس کو کہ وہ قائم کرنا چاہیں، لہٰذا وہ تو کبھی بھی دانش مند اور ذی فہم طبقے سے مخاطب نہیں ہوتے، بلکہ وہ تو ایسی کوشش کرتے ہیں جسے میں 'BACK DOOR ENTRY' کہا کرتا ہوں یعنی پیچھے سے شب خون مارنا ــــ معاشرے کے گرے پڑے، دبے ہوئے اور پسے ہوئے طبقات میں جا کر تبلیغ کرنا، ان میں دودھ کے ڈبے تقسیم کر دینا،

ان کی بچیوں کو کچھ پڑھا کر نرسیں بنا دینا اور اس طرح ان کے دلوں میں اپنے لئے جگہ پیدا کرنا اور ان کے نام بدل دینا! بس یہ کام رہا ہے ان کا۔ اسلام کی تبلیغ کبھی اس انداز کی نہیں رہی۔ اسلام کا تو FRONTAL ATTACK ہوتا ہے۔ جس معاشرے میں بھی اسلام تبلیغ کرنا چاہتا ہے وہ سب سے پہلے اس کے ذہین ترین طبقات کو خطاب کرے گا، اس کے فلسفے اور حکمت کو چیلنج کرے گا، اپنے فلسفہ اور حکمت کو دلیل سے پیش کرے گا۔ قرآن تو کہتا ہے: هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ۔ "اگر تم سچے ہو تو دلیل لاؤ، پیش کرو۔ ہم جو بات کر رہے ہیں، دلیل سے کر رہے ہیں: هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ـــ یعنی یہ میرا راستہ ہے، میں اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں نہیں مار رہا ہوں۔ میں اللہ کی طرف بُلا رہا ہوں اور میں اور میرے متبعین علیٰ وجہ البصیرت اس راستے کو اختیار کئے ہوئے ہیں۔ تو ہم تو عقل، منطق، فلسفہ اور حکمت کے حوالے سے بات کرتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ ہمارے پاس تو ایک نظام عدلِ اجتماعی ہے، ایک معاشرتی عدل و مساوات کا نظام جسے ہم پیش کرتے ہیں۔ اس اعتبار سے ہندوستان کے بارے میں ہمارا جو یہ خیال رہتا ہے یہ درست نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اگر بادشاہوں نے یہ کام کیا ہوتا تو واقعہ یہ ہے کہ ہر چین سب کے سب مسلمان ہو چکے ہوتے۔ وہ تو ہماری ایک تاریخی کوتاہی ہے لیکن اب یہ سمجھنا کہ تبلیغ کا ہدف وہ ہیں، یہ غلط ہے۔ یہ درحقیقت اسلام کے تبلیغی مزاج سے مناسبت رکھنے والی بات نہیں ہے۔

آپ نے شاید پہلے میرے زیادہ خطبات نہیں سنے ہیں، میں نے شاہ ولی اللہؒ کی "تفہیماتِ الٰہیہ" کی ایک عبارت کا کئی مرتبہ حوالہ دیا ہے۔ انہوں نے یہ کہا ہے کہ ایک وقت آئے گا کہ ہندوستان کے اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کی اکثریت اسلام قبول کر لے گی۔ میرے نزدیک یہ ہے اصل ٹارگٹ جس کے اوپر محنت کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم پہلے ہندو ذہن کو پڑھیں، ہندو فلسفے کو سمجھیں، ہندوؤں کے اندر مختلف عقائد کی نوعیت معلوم کریں۔ ہندوؤں کے اندر فلسفے کے چھ مکاتیبِ فکر موجود ہیں۔ فلسفے کے جتنے بھی مکاتیبِ فکر ممکن ہو سکتے ہیں وہ ہندوؤں کے ہاں موجود ہیں۔ ہندو ملحد بھی ہوتا ہے، موحد بھی ہو سکتا ہے اور ان میں بدترین مشرک بھی ہیں۔ ہندو اصل میں کسی مذہب کا نام نہیں، بلکہ ہندو تو ایک کلچر اور ایک تہذیب ہے جس کے اندر نہ معلوم کتنے فلسفے ہیں۔ ہم نے بدقسمتی سے ہندومت کو سمجھا ہی نہیں ہے۔ ہمارا تو جو حال ہے اس کا اندازہ

ذرا اس واقعے سے لگائیے۔ بمبئی میں ایک صاحب ہیں جنہوں نے ادارہ دعوت القرآن قائم کیا ہے اور وہ مرہٹی زبان میں قرآن حکیم کا ترجمہ آسان تفسیری حواشی کے ساتھ شائع کر رہے ہیں۔ میری ان سے چھ سال قبل ملاقات ہوئی۔ میں جب مدراس جا رہا تھا تو ان کے پاس ٹھہرا تھا۔ میں ان کے دفتر میں گیا تو یہ دیکھ کر خوش ہوا کہ قرآن کا کام ہو رہا ہے۔ میں نے ان سے ایسے ہی ایک سوال کر لیا کہ یہ وید کتنے ہیں تعداد میں؟ کہنے لگے کہ مجھے تو معلوم نہیں۔ میں نے پوچھا کہ آپ نے وید نہیں پڑھے؟ انہوں نے کہا کہ نہیں! میں نے کہا کہ آپ ہندو ذہن کو اپیروچ کرنا چاہتے ہیں اور حال آپ کا یہ ہے کہ آپ نے ان کی مذہبی کتاب کا مطالعہ بھی نہیں کیا۔ آپ کو پتہ ہی نہیں کہ اس کا ذہن کیا ہے۔ اس کی سوچ کیا ہے؟ جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ مخاطب کا ذہن کیا ہے اس کی سوچ کیا ہے، کہاں چوٹ لگائی جانی چاہیئے، کہاں سے مشترکہ نکتہ نکال کر بات شروع کی جائے، آپ اپنی دعوت مؤثر انداز میں کیسے پیش کر سکتے ہیں۔ دعوت و تبلیغ کی اہم ترین حکمت یہ ہوتی ہے کہ آپ اپنے اور مخاطب کے درمیان ایسا نکتہ تلاش کریں جو مشترک ہو۔ اس کے لئے آپ کو خواہ کتنا ہی نیچے جانا پڑے جائیے! اور جہاں کہیں کوئی مشترک نکتہ ملے تو اس کی اساس پر تعمیر کا آغاز کیجئے۔ اس کے لئے میں 'زپ' کی مثال دیا کرتا ہوں کہ اسے آپ اوپر سے جوڑیں گے تو نہیں جڑے گا، جبکہ آپ اس کے 'ٹنک' کو اس کے سب سے نچلے سرے سے کھینچتے ہوئے اوپر لائیے تو اس کے دندانے بڑی آسانی سے ایک دوسرے میں فٹ ہوتے چلے جائیں گے۔ قرآن میں بھی بار بار مشترکہ نکات کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔ مثلاً اہل کتاب سے کہا گیا کہ تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ۔ اور اس کے علاوہ اَللّٰہُ رَبُّنَا وَ رَبُّکُمْ۔ یعنی اس نکتہ سے بات شروع کر دی کہ ہمارا رب اور تمہارا رب اللہ ہے۔

اس اعتبار ہم نے بدقسمتی سے ہندو ذہن کو سمجھا ہی نہیں۔ جس طرح عربوں نے شروع میں جو کام کیا ہوگا کیا ہوگا، باقی تو عیش کیے ہیں، اسی طرح ہم نے بھی یہاں آٹھ سو برس تک محل بنائے، قلعے بنائے، مقبرے بنائے، تاج محل بنائے اور عیش کیے۔ ہم نے نہ یہاں کے ذہن کو سمجھنے کی کوشش کی، نہ یہاں پر تبلیغ کی کوئی قومی سطح پر کوشش ہوئی۔ جو بھی کوشش ہوئی وہ صوفیاء کرام نے کی ہے اور ان کے ذریعے سے اسلام یہاں پھیلا ہے۔ تو ہندوستان میں دراصل ہمارا جو ٹارگٹ ہونا چاہیئے وہ ان کا ذہین طبقہ ہے۔ اور اس دعوت و تبلیغ میں جیسا کہ میں امریکہ میں کہہ کر آیا ہوں، اصل زور ایمان پر ہو اور اس ایمان کی رسائی فلسفیانہ سطح

پر ہو اور اس کی ORIENTATION انقلاب کی ہو کہ آپ اپنا نظام عدلِ اجتماعی جو ہے اس کو پیش کریں کہ یہ ہے وہ نظامِ حیات جس کی طرف اسلام دعوت دیتا ہے۔ بہرحال ہندوستان کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ ہریجنوں کی طرف زیادہ توقع سے نہیں دیکھنا چاہیئے۔ آپ کو یاد ہوگا ابھی جو کچھ ہوا تھا تامل ناڈو میں کہ چند دیہات کے ہریجن مسلمان ہو گئے تھے، لیکن ہندوستان میں اس کا شدید ردِ عمل ہوا۔ ظاہر بات ہے کہ اونچی ذات کا کوئی ہندو مسلمان ہو جائے تو اُسے کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا، اس کا اپنا ایک مقام اور حیثیت ہے۔ لیکن یہ نیچ ذات کے لوگ جو ہیں ان کے اوپر تو پھر دباؤ پڑتا ہے۔ چنانچہ اس دباؤ کے نتیجے میں ان کی بہت بڑی تعداد پھر مرتد ہو گئی۔ اور دراصل وہ تبلیغ بھی بدقسمتی سے ایسی ہوئی تھی جس کے لئے میں نہ چاہتے ہوئے بھی پیٹروڈالر تبلیغ کا لفظ استعمال کر رہا ہوں۔ آج کل ہمارے ہاں اس طرز کی تبلیغیں ہو رہی ہیں کہ سعودی عرب میں کچھ لوگ دین کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ پھر بڑی بڑی تنخواہوں پر ان کو دوسرے ملکوں میں مبعوث کر دیا جاتا ہے اور عیسائی مشنریوں جیسا کام کیا جاتا ہے۔ تو وہاں پر عیسائی مشنریوں کے انداز میں جو پیٹروڈالر تبلیغ ہوئی ہے وہ بے بنیاد ثابت ہوئی ہے۔ چنانچہ تامل ناڈو کے کچھ گاؤں جو مسلمان ہو گئے تھے ان کی اکثریت کو انہوں نے RECLAIM کر لیا اور جوابی طور پر انہوں نے راجستھان کے بیچارے غریب مسلمانوں پر بڑی شدت کے ساتھ تبلیغی یلغار کی۔ تو دراصل ہندوستان میں اس سطح پر کام کرنا مفید نہیں ہے۔ ہندوستان میں کام مفید ہوگا فلسفہ و حکمتِ قرآنی کی سطح پر اور اسلام کے نظامِ عدلِ اجتماعی کو پیش کر کے۔

یورپ کے بارے میں آپ کا مشاہدہ بہت عمدہ ہے، بہت صحیح ہے۔ اصل میں یورپ نام ہی سنٹرل یورپ کا ہے، یعنی فرانس اور جرمنی اور انہی کے نیچے اٹلی جو ایک ٹانگ کی صورت میں نکلا ہوا ہے۔ یہ گویا کہ یورپ کا قلب ہے۔ اوپر کی طرف فرانس سے ملحق انگلستان کے جزائر ہیں۔ صرف رود بارِ انگلستان ان کو الگ کرتی ہے جس کی غالباً صرف پچاس ساٹھ میل چوڑائی ہے۔ باقی جو اس کے بعد کا علاقہ ہے IBERIAN PENINSULA وہ بھی اس معنی میں یورپ شمار نہیں ہوتا۔ ان کا اپنا علیحدہ کلچر ہے، علیحدہ تہذیب ہے۔ اسی طریقے سے مشرقی یورپ کے بارے میں بھی آپ کی بات صحیح ہے اور آپ کا یہ مشاہدہ درست ہے کہ اس وقت جرمنی اور فرانس میں کثیر تعداد میں مسلمان پہنچ گئے ہیں۔ جرمنی میں بدقسمتی سے ترک، زیادہ پہنچے ہیں جن کے اندر اسلام کا معاملہ مصطفیٰ کمال پاشا کی تحریک کی وجہ

سے بہت کمزور پڑ چکا ہے۔ لیکن اگر ان کے اندر جذبۂ ایمانی کا احیاء ہو جائے تو ان میں قوتِ کار بے پناہ ہے، یہ آج بھی بڑی جاندار قوم ہے اور بنیادی طور پر شریف قوم ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے کئی مرتبہ اپنی تقریروں میں کہا ہے کہ یہ قوم ردِ عمل کا شکار ہو گئی۔ میں تو مصطفیٰ کمال پاشا کو بھی الاؤنس دیتا ہوں کہ اس پر اُس بغاوت کا ایک شدید ردِ عمل ہُوا تھا جو عربوں نے ترکوں کے خلاف کی تھی اور جس میں ہزاروں ترکوں کو شہید کیا تھا۔ تو اس طرح کی صورتحال میں فوری ردِ عمل تو ہوتا ہے۔ اس نے اصل میں جس چیز کی نفی کی وہ تھی عربیت۔ عربی زبان، عربی رسم الخط، عربی لباس، حتیٰ کہ عربی اذان اور نماز۔ گویا کہ جو شے بھی عربی تھی اس سے اس کو شدید نفرت ہو گئی۔ تو اگر آپ مصطفیٰ کمال کے لئے ہمدردی کے ساتھ سوچنا چاہیں تو اس کے اقدامات کا ایک فوری عامل موجود تھا۔ لیکن اس وقت میں صرف یہ کہہ رہا تھا کہ جرمنی میں جو زیادہ تارکینِ وطن آئے ہیں وہ ترک ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جرمنی اور ترکی مختلف مواقع پر آپس میں اتحادی (ALLIES) رہے ہیں۔

فرانس میں جو مسلمان آئے ہیں وہ زیادہ تر الجزائر اور مراکش وغیرہ سے آئے ہیں، چونکہ فرانس الجزائر پر قابض رہا تھا اور اس وقت ڈاکٹر حمید اللہ جیسی ایک شخصیت پیرس میں موجود ہے اپنے اس سفر میں مَیں نے خاص طور پر ان سے ملاقات کی اور اس کے لئے میں دو دن پیرس میں رکا۔ ان کا جو قرآن حکیم کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ ہے وہ لاکھوں کی تعداد میں چھپ چکا ہے اور وہ اللہ کا بندہ ایسا درویش صفت انسان ہے کہ ایک پیسہ رائلٹی نہیں لیتا، جبکہ وہ بالکل غربت کی زندگی بسر کر رہا ہے اور عمر بھی اب اسّی برس سے اوپر ہے۔ وہ کہیں ایک کمرے میں رہتے ہیں اور اس عمر میں ایک سو بارہ سیڑھیاں چڑھ کر اپنے کمرے تک پہنچتے ہیں۔ اسی لئے وہ کسی ملاقاتی کو وہاں دعوت نہیں دیتے کہ آپ وہاں آئیں گے تو آپ کو تکلیف ہو گی۔ فلاں جگہ پر ملاقات ہو جائے گی۔ میرے دونوں لیکچرز میں وہ موجود رہے۔ اور میرے خاصے طویل لیکچرز انہوں نے پہلی صف میں بیٹھ کر اطمینان کے ساتھ سُنے۔ انہوں نے آج سے پندرہ سال قبل یہاں لاہور میں جناح ہال کے اندر تقریر کی تھی اور کہا تھا کہ اس وقت پیرس یورپ کا سب سے بڑا مسلم شہر بن گیا ہے۔ اُس وقت انہیں نے کہا تھا کہ پیرس میں مسلمانوں کی تعداد پانچ لاکھ ہے۔ وہاں لاتعداد مساجد ہیں۔ ان کے قبرستان علیحدہ ہو گئے ہیں۔ حکومت نے تسلیم کیا ہے کہ یہ ایک بہت بڑی اقلیت ہیں۔ وہاں پر ہر جمعہ کو دو تین آدمی ان کے پاس آتے رہتے ہیں جو اسلام لا رہے ہیں۔ اور وہ کہتے ہیں کہ میں حیران ہوں کہ یہ اسلام کیوں لا رہے ہیں،

ہمارے پاس تو کوئی ایسی شے نہیں ہے جو انہیں مائل کر سکے، ہمارے اندر تو اُن کے لئے کوئی کشش نہیں ہے، پھر کونسی چیز ہے جو انہیں اسلام کی طرف مائل کر رہی ہے، لیکن بہرحال لوگ اسلام قبول کر رہے ہیں۔ بہرحال آپ کی یہ بات درست ہے کہ اگر وہاں پہ دعوت و تبلیغ کا کام ہو تو یقیناً بارآور ہوگا۔

یہ بات بھی آپ کی بہت صحیح ہے کہ یورپ کے مروجہ قوانین تبلیغ کے لئے نہایت سازگار ہیں۔ میں کہا کرتا ہوں کہ یہ عمرانی ارتقاء جو ہوا ہے اس نے کام بہت آسان کر دیا ہے۔ آج سے پہلے ریاست اور حکومت ایک شے کا نام تھا۔ حکومت سے اختلاف کے معنی یہ تھے کہ آپ ریاست کے باغی ہو گئے۔ کوئی سیاسی حقوق نہیں تھے۔ اختلافِ رائے کا حق نہیں تھا۔ آپ کو کوئی بات کہنے کی اجازت نہیں تھی۔ لیکن جمہوریت میں انسانوں کو حقوق دیئے گئے ہیں اگرچہ مطلق جمہوریت جسے 'عوام کی حاکمیتِ مطلقہ' کہا جاتا ہے وہ تو کفر اور شرک ہے۔ اس میں اور بادشاہتِ مطلقہ میں دینی اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے۔ لیکن اس اعتبار سے عظیم فرق ہے کہ جمہوریت میں انسانی حقوق کا احترام کیا جاتا ہے کہ تم بھی انسان ہو، ہم بھی انسان ہیں۔ تمہارے بھی دو ہاتھ اور دو پاؤں ہیں، ہمارے بھی دو ہاتھ اور دو پاؤں ہیں۔ تمہارے کچھ حقوق ہیں تو ہمارے بھی حقوق ہیں۔ تو وہ جو جبر کا ایک دَور تھا وہ ختم ہو چکا ہے۔ آج امریکہ میں مسلمانوں کو پوری آزادی ہے کہ وہ مسجدیں بنائیں یا اسلامک سنٹر بنائیں۔ چنانچہ وہ چرچ خریدتے ہیں اور مسجدیں بنا لیتے ہیں۔ آپ کی بات صحیح ہے کہ اب دین کا کام کرنے کے لئے اس سے بڑی سہولت حاصل ہو گئی ہے، بشرطیکہ کام کرنے والوں میں جان ہو، جذبہ ہو اور عزم و ہمت ہو۔

آخری بات جو آپ نے کی تھی امریکہ میں یہودیوں کے ردِ عمل والی تو یقیناً اس کا اندیشہ ہے اور پچھلے دنوں امریکہ میں مسلمانوں کے قتل کی جو دو وارداتیں ہوئی ہیں ان کے بارے میں یہی اندازہ ہوا ہے کہ وہ یہودیوں ہی نے کرائے کے قاتلوں کے ذریعے کروائی ہیں۔ مقتولوں میں ایک صاحب پاکستانی تھے جو پاک فوج میں میجر ہوتے تھے۔ آرمی سے ریٹائر ہو کر سعودی عرب چلے گئے، مدینہ یونیورسٹی میں جا کر کئی سال لگائے، عربی سیکھی، دینی علم حاصل کیا اور اس کے بعد امریکہ چلے گئے اور وہاں تبلیغ کا کام کر رہے تھے۔ آج سے چار پانچ سال پہلے انکو قتل کر دیا گیا تھا۔ ان کی لاش ایک کار میں پڑی ہوئی تھی۔ اسی طرح اسماعیل فاروقی صاحب وہاں علمی سطح پہ بڑا کام کر رہے تھے۔ وہ ایک لبنانی مسلمان

تھے۔ پاکستان بھی وہ کئی مرتبہ آئے ہیں۔ جنرل ضیاء الحق مرحوم ان کی بڑی قدر کرتے تھے۔ مختلف بین الاقوامی کانفرنسوں میں ان کا کافی عمل دخل ہوتا تھا۔ گذشتہ سال اُن کو اور ان کی اہلیہ کو بھی قتل کر دیا گیا۔ تو اس بات کا تو اندیشہ ہے کہ وہاں پر یہودی لابی خاص طور پر مزاحمت کرے گی، چونکہ وہ تو بہت ہی بیدار لوگ ہیں، گرد و پیش پر نظر رکھتے ہیں کہ کس چیز میں ہمارے لئے کیا اندیشہ ہے، کیا خطرہ ہے۔ لیکن ظاہر بات ہے کہ دنیا میں جب دعوتیں اور تحریکیں چلتی ہیں تو ان تمام خطرات کے باوجود چلتی ہیں۔ جن کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس طرح کی موت لکھی ہے ان کے لئے تو گویا بہت بڑی سُرخروئی ہے۔

باقی یہ کہ تحریکوں کے راستے اس طرح رُکا نہیں کرتے اور اس وقت امریکہ میں بھی یہ صورت پیدا ہوتی نظر آرہی ہے کہ رائے عامہ یہودیوں کے خلاف ہموار ہو جائے۔ اس PHENOMENON کو میں کئی سالوں سے دیکھ رہا ہوں اور اس مرتبہ میں نے اس میں ایک مزید پیش رفت دیکھی ہے۔ دو سال پہلے میں وہاں گیا تھا تو ایک بڑی موٹی کتاب منظر عام پر آئی تھی " THE DARE TO SPEAK " - یہ ایک امریکی عیسائی نے لکھی تھی جو کبھی سینیٹر ہوتا تھا، کانگریس مین تھا، لیکن اس کے بعد چونکہ اس نے یہودیوں پہ کچھ تنقید کی تھی لہٰذا یہودیوں نے اس کے خلاف ایسی مہم چلائی کہ پھر وہ الیکشن میں ناکام ہو گیا۔ اس نے پھر یہ ضخیم کتاب اس پر لکھی کہ یہودی ہمارے ملک میں اتنی قلیل اقلیت میں ہونے کے باوجود (یہ زیادہ سے زیادہ تیس لاکھ ہیں) ہمارے ہاں اتنے دخیل ہو چکے ہیں کہ پوری سیاست پر ان کا کنٹرول ہے۔ اور کوئی شخص ان پر ذرا سی بھی تنقید کرتا ہے تو وہ اس کے سیاسی کیریئر کو بالکل تباہ و برباد کر کے رکھ دیتے ہیں۔ اس کی اس نے کئی مثالیں دیں اور پچیس تیس امریکی افراد کا تذکرہ کیا جنہوں نے کبھی کسی موقع پر اسرائیل پر یا یہودیوں پر تنقید کی، تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے خلاف کردار کشی کی ایسی مہم چلائی گئی کہ وہ سب کے سب رائے عامہ کی نظر میں بلیک لسٹ ہو کر رہ گئے۔ اور اس مرتبہ جو میں دیکھ کر آیا ہوں وہ یہ ہے کہ اسرائیل کے مقبوضہ علاقے ویسٹ بنک وغیرہ میں حال ہی میں جو بیداری کی لہر پیدا ہوئی ہے اور ایک تحریک اٹھی ہے، جس میں نوعمر بچے سڑکوں پر نکل کر پتھراؤ کر رہے ہیں، اس پر ایک فلم بنائی گئی ہے۔ یہ فلم امریکی ٹیلیویژن کے لئے بنائی گئی تھی تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ اسرائیل میں کیا ہو رہا ہے۔ یہ فلم یہودیوں نے چھ مہینے تک رکوائے رکھی اور

اس کی نمائش نہیں ہونے دی۔ ان کی طرف سے ایک دباؤ تھا کہ اس کو روکا جائے۔ اس سے بہت غلط اثرات مترتب ہوں گے ـــــ لیکن محسوس ہوتا ہے کہ جس نے یہ کام کیا تھا بالآخر وہ کامیاب ہوا اور جن دنوں میں وہاں تھا، وہ فلم دکھائی گئی۔ وہ فلم ایسی ہے کہ جو بھی اُسے دیکھے گا اس کے دل میں فلسطینیوں کے لئے ہمدردی اور یہودیوں کے لئے نفرت کے جذبات پیدا ہوں گے۔ یہ گویا کہ اس کا توڑ ہے کہ جو ہمدردی یہودیوں نے HOLOCAUST فلم کے ذریعے سے امریکیوں کی حاصل کی تھی۔ یہ فلم ہٹلر کے مظالم پر مبنی ہے کہ کس طرح اس نے یہودیوں کا قلع قمع کیا تھا۔ یہ غالباً چودہ پندرہ گھنٹے کے دورانیے کی ایک طویل فلم ہے جسے کئی حصّوں میں دیکھنا پڑتا ہے۔ میں نے کوئی تین سال پہلے بڑی محنت کر کے پروگرام بنا کر وہ فلم مکمل دیکھی تھی۔ وہ فلم واقعتہً ایسی ہے کہ جو شخص اس کو دیکھ لے اس کے دل میں یہودیوں کے لیے اتنی ہمدردی پیدا ہو جائے گی کہ پھر وہ سوچے گا کہ ان سے زیادہ مظلوم تو دنیا میں کوئی ہے ہی نہیں اور ان کی تو ہر طریقے سے مدد کی جانی چاہیئے۔ یہ جو اسرائیل کی پشت پر امریکی رائے عامہ کی حمایت ہے اس میں بڑا ہاتھ اُس ایک فلم کا ہے۔ جب کبھی امریکہ میں کوئی بات اسرائیل کے خلاف آتی ہے تو وہ ٹیلیویژن پر ' HOLOCAUST ' فلم دکھانی شروع کر دیتے ہیں تاکہ وہ ہمدردی کے جذبات پھر سے تازہ ہو جائیں۔ اور ظاہر بات ہے کہ جو کچھ ہٹلر نے کیا تھا وہ بڑا ہی روح فرسا اور رونگٹے کھڑے کر دینے والا ہے۔ وہ تو ان کے ساتھ بخت نصر نے جو کچھ کیا تھا چھ لاکھ یہودی قتل کئے تھے، اس کی اگر کہیں فلم بنی ہوتی اور وہ فلم دکھائی جاتی تو اس کے کیا اثرات ہوں گے! یا ٹائٹس رومی نے جو ایک لاکھ بیس ہزار یہودی ایک دن میں قتل کئے تھے اس کی فلم دکھائی جائے تو یہودیوں کے ساتھ کس قدر ہمدردی کے جذبات پیدا ہوں گے! اسی طرح یہ غالباً چھ ملین یعنی ساٹھ لاکھ یہودی ہیں جو ہٹلر نے قتل کئے کہا جاتا ہے کہ ان کا قلع قمع کرنے کے لئے خاص طور پر ڈیزائن کر کے ایسے خود کار پلانٹ تیار کروائے گئے جن کے ایک طرف یہودیوں کو ڈالا جاتا اور دوسری طرف سے ایک سیال مادہ باہر نکل جاتا ـــــ تو ان مظالم کی منظر کشی سے امریکیوں میں یہودیوں کے لئے جو ہمدردی پیدا ہوتی ہے اب اس کا توڑ اس طرح سے ہو رہا ہے کہ فلسطینیوں پر اسرائیلی یہودی جو مظالم توڑ رہے ہیں اسے امریکیوں کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔ گویا کہ یہ کچھ ہٹلر نے یہودیوں کے ساتھ کیا تھا۔ اب یہ یہودی وہی کچھ فلسطینیوں اور ان کے بچّوں اور عورتوں

کے ساتھ کر رہے ہیں ۔ تو یہ ایک جذبہ وہاں ابھر رہا ہے یعنی امریکی رائے عامہ پر یہود کا جو تسلط ہے اب اس کا توڑ بھی ہو رہا ہے ۔

ایک بات آپ کو اور بتا دوں کہ سیاہ فام باشندوں میں خاص طور پر یہودیوں کے خلاف کافی ردّ عمل ہے لیکن بقول اقبال ؎ " فرنگ کی رگ جاں پنجۂ یہود میں ہے " کے مصداق سیاہ فاموں کی جان تو خاص طور سے یہودیوں کے قبضہ میں ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہود کی بہت سی ویلفیئر تنظیمیں ہیں، جن کے ذریعے سے وہ وہاں پر غریبوں کو مدد دیتے ہیں ۔ جب ذرا کہیں ان سیاہ فام باشندوں کے اندر اسرائیل یا یہودیوں کے خلاف تھوڑی سی بھی تحریک پیدا ہوتی ہے تو وہ فوراً اپنے فنڈ کھینچ لیتے ہیں ۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ ٹھنڈے ہو جاتے ہیں ۔ گویا یہودی انہیں اس طریقے سے پیٹ کی مار دیتے ہیں ۔ لیکن ان تمام عناصر کے ہوتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ یہ محض وقتی سا معاملہ ہے۔

میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ امریکہ میں بھی یہود کے خلاف وہی ردّ عمل پیدا ہوگا جو کہ جرمنی میں ہوا تھا ۔ اسی طرح امریکی رائے عامہ ان کے خلاف ہوگی ، انہیں احساس ہو جائے گا کہ کس طرح ان لوگوں نے ہمیں بے وقوف بنا کر رکھا ہے ۔ اور کس طرح انہوں نے اپنے پنجے ہمارے اوپر گاڑے رکھے ہیں ۔ اور اس کا ردّ عمل پھر شدید ہوگا ۔

لیکن یہ کب تک ہوتا ہے ، اس میں وقت کتنا لگتا ہے ۔ اس بارے میں ہم کچھ نہیں کہہ سکتے ، واللہ اعلم ! ہو سکتا ہے کہ اس میں پندرہ بیس یا چالیس پچاس سال لگ جائیں ۔ اللہ کی تقویم جو ہے وہ لمبی ہے ۔ بہر حال آپ کی یہ باتیں غور و فکر کی راہیں کھولنے والی تھیں اور یہ چیزیں واقعۃً مطالعے پر مبنی ہیں تو میں نے مناسب سمجھا کہ اس کے مختلف پہلوؤں سے میں اپنی رائے کا اظہار کر دوں ۔

اہل پشاور کے لیے ایک خوش کن اطلاع !

امیر تنظیم اسلامی، ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے خطابات ہر ماہ کے پہلے اور تیسرے منگل کو دفتر تنظیم اسلامی، ۱۰ اے، رحمٰن پلازہ خیبر بازار پشاور میں بعد نماز مغرب بذریعہ ویڈیو دکھائے جاتے ہیں ۔

بقیہ 'عرضِ احوال'

ہے جو قرآنِ حکیم کے انقلابی پیغام سے متاثر ہو کر نہ صرف یہ کہ اپنی زندگیوں میں قرآن کی تعلیمات کے مطابق انقلاب لانے کا عزمِ مصمم رکھتے ہوں بلکہ ایک ہمہ گیر اسلامی انقلاب کے لئے جان و مال کے ایثار کے لئے آمادۂ عمل بھی ہوں اور اس مقصد کے لئے تنظیم کے ڈسپلن کو قبول کرنے کا فیصلہ کر چکے ہوں۔ علومِ قرآنی کی عمومی نشر و اشاعت کے ساتھ ساتھ دورِ حاضر کی اعلیٰ علمی سطح پر تعلیماتِ وہدایتِ قرآنی کو پیش کرنے کا انتہائی کٹھن، صبر آزما اور مشقت طلب کام بھی انجمن کے پیشِ نظر ہے جو اسلام کے عالمی غلبۂ ثانی کی راہ کی ایک ناگزیر ضرورت ہے چنانچہ اسی سلسلے میں ابتدائی اور تمہیدی کام کے طور پر قرآن کالج اور قرآن اکیڈمی کے تعلیمی منصوبوں پر بالفعل اللہ کے فضل و تائید کے سہارے کام کا آغاز بھی کیا جا چکا ہے، جبکہ تنظیم اسلامی وطن عزیز پاکستان میں غلبہ و نفاذِ اسلام یعنی اسلامی انقلاب کے لئے افراد کو تربیت و تنظیم کے مراحل سے گزار کر ان کے ذریعے ایک اسلامی انقلابی پارٹی کی تشکیل کے لئے سرگرمِ عمل ہے۔ ظاہر بات ہے کہ انقلابِ اسلامی کے لئے جہاں خدمتِ دینی اور جوشِ جہاد سے سرشار خود اسلام پر عمل پیرا مردانِ کار پر مشتمل ایک مضبوط اور منظم انقلابی جماعت ناگزیر ہے وہاں انقلاب کے دوام اور اس کے استحکام کے لئے فکر و نظر کی سطح پر اس علمی کام کی اہمیت و ضرورت سے بھی انکار ممکن نہیں جس کے لئے انجمن نے اپنے محدود وسائل کے ساتھ اللہ کی نصرت و تائید کے بھروسے پر کام کا آغاز کر دیا ہے۔ اس اعتبار سے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ انجمن اور تنظیم دراصل ایک ہی تحریک کے دو ایسے شعبے ہیں جو ایک دوسرے کے لئے تقویت و اعانت کا باعث ہیں، ——— ان سطور میں انجمن خدام القرآن اور اس کے پیشِ نظر علمی کام کی اہمیت کی جانب توجہ دلانا اس لئے مقصود ہے کہ انجمن اب خدمتِ قرآنی کے جس مرحلے میں داخل ہو گئی ہے اُس میں اس بات کی شدّت سے ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اس ادارے کی بنیادوں کو وسیع کیا جائے۔ اس کے معاونین اور ارکان کی تعداد میں اب خاطر خواہ اضافہ ہونا چاہیئے تاکہ جن تعلیمی منصوبوں کا آغاز کیا گیا ہے وہ باحسن وجوہ پایۂ تکمیل کو پہنچ سکیں۔

اس سلسلے میں ضمیمۂ میثاق کے طور پر مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی طرف سے ایک دو ورقہ اس شمارے کے آخر میں شامل کیا گیا ہے جس میں رکنیت فارم بھی شامل ہے۔ قارئینِ میثاق سے گزارش ہے کہ ان دو صفحات کا ضرور مطالعہ کریں اور خدمتِ قرآنی کے اس نیک

کام میں اپنا حصّہ ادا کرنے میں تاخیر و تعویق سے کام نہ لیں بلکہ اپنے احباب کو بھی اس جانب متوجہ کریں ۔ اس لئے کہ جہاں تک انجمن کا تعلق ہے اس کی رکنیت ہر وہ شخص حاصل کر سکتا ہے جو اس کے اغراض و مقاصد سے عمومی اتفاق کرتے ہوئے خدمتِ قرآنی کے اس کام میں مالی معاونت پر آمادہ ہو اور ایک معیّن شرح سے جو کم و بیش بھی ہو سکتی ہے ہر ماہ زرِ تعاون ادا کرتا رہے ۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اگر وقت اور صلاحیتوں کا انفاق بھی کر سکے تو سر آنکھوں پر لیکن اس سلسلے میں انجمن کی طرف سے کسی پر کوئی پابندی نہیں ہے ——— لیکن واضح رہے کہ انجمن کی سطح پر تعاون کو ہم خدمتِ دینی کے وسیع تر اور ہمہ گیر کام کا محض ایک جزو سمجھتے ہیں ۔ ورنہ دین کی جانب سے عائد شدہ ذمہ داریوں سے کما حقہٗ عہدہ برآ ہونے کے لئے کسی ایسی جماعت کے نظم کو قبول کرتے ہوئے اس کے ڈسپلن کی پابندی ضروری ہے جو غلبہ و اقامتِ دین کے لئے تشکیل دی گئی ہو ، جس کا منہجِ عمل سنّتِ رسولؐ سے قریب تر ہو ، اور جس کے اوّلین تقاضے کے طور پر افراد خود اپنی زندگیوں میں احکامِ دین کو نافذ و قائم کرنے کا ارادہ و عزم ہی نہ رکھتے ہوں بالفعل کوشاں بھی ہوں ۔ اس لئے کہ ملک و ملّت کی سطح پر غلبہ و اقامتِ دین کی جدوجہد سے پہلے اپنے نفس سے کشمکش کر کے اسے اطاعتِ الٰہی کا خوگر بنانا ازبس ضروری ہے ؎

تو خاک میں مل اور آگ میں جل جب خشت بنے تب کام چلے
ان خام دلوں کے عنصر پہ بنیاد نہ رکھ تعمیر نہ کر!

ماہ نومبر کے دوران امیرِ تنظیم اسلامی کے اندرونِ پاکستان دو دعوتی سفر ہوئے ۔ اوّلاً ۶ تا ۸ نومبر کوئٹہ کا پروگرام بنا جہاں دیگر دعوتی و تنظیمی پروگراموں کے علاوہ انجمن خدام القرآن بلوچستان کی داغ بیل بھی ڈالی گئی ۔ پھر ۲۰ تا ۲۴ نومبر امیرِ تنظیم نے ملتان اور فیصل آباد کا دورہ کیا ۔ ان دوروں کی رپورٹیں ہمیں موصول ہو گئی تھیں لیکن 'میثاق' کی تنگ دامانی آڑے آئی ۔ ہماری کوشش ہو گی کہ اگلے شمارے میں انہیں ضرور شامل کر دیا جائے ۔ 'الہدیٰ' کی قسط بھی اس بار شاملِ اشاعت نہیں ہے جس کے لیے ہم قارئین سے معذرت خواہ ہیں ۔

★★★

رُودادِ سفر

(دوسری قسط)

بھارت میں چودہ ۱۴ دن

مرتب: شیخ رحیم الدین

۱۵ ؍ اکتوبر بروز اتوار

آج صبح ۸ بجے پبلک گارڈن (باغ عامہ) کی شاہی مسجد میں امیر محترم کے درس قرآن کا پروگرام طے تھا۔ یہاں ہر اتوار کو صبح ۸ بجے حافظ قاری تقی الدین صاحب درس قرآن دیتے ہیں۔ جس میں قریباً ۵۰۰ مرد و خواتین شرکت کرتے ہیں۔ مگر آج کے لئے انتظامیہ نے خصوصی انتظامات کئے تھے اس لئے کہ توقع تھی کہ درس قرآن کا یہ اجتماع بھی سابقہ اجتماعات کی طرح بھرپور ہو گا۔ اور ایسا ہی ہوا۔ حاضرین کی تعداد دو ہزار سے کم نہ تھی۔ سامعین نے انتہائی دلجمعی اور صبر و سکون کے ساتھ امیر محترم کا ڈیڑھ گھنٹے کا درس سنا۔ امیر محترم نے سورۃ آل عمران کی تین آیات (۱۰۲ تا ۱۰۴) کا درس دیا۔ جس میں آپ نے مسلمانوں کی فلاح و کامیابی کے لئے قرآن حکیم کا سہ نکاتی پروگرام یعنی تقویٰ، اتحاد اور دعوت الی الخیر اور اسی ضمن میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اہمیت پر سیر حاصل بحث فرمائی۔ درس کے اختتام پر بعض حضرات نے کچھ وضاحتیں چاہیں۔ موصوف نے ان کو تسلی بخش جواب عنایت فرمائے۔

یہاں سے فارغ ہو کر ہم سیدھے اپنی قیام گاہ پہنچے۔ یہاں امیر محترم سے ملاقات کے لئے صدیق محمد جعفری صاحب تشریف لے آئے جو بنگلور سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ نے امیر محترم کے بنگلور کے دورہ کو آخری شکل دی اور اس ضمن میں امیر محترم سے صلاح و مشورہ کیا۔

آج دو بجے بعد دوپہر کاشم ہال گاندھی بھون میں "امت مسلمہ کا ماضی" کے عنوان پر امیر محترم کو خطاب فرمانا تھا۔ اس اجلاس کی صدارت جناب محمود انصاری صاحب ایڈیٹر روزنامہ "منصف" حیدر آباد نے فرمائی جبکہ مہمان خصوصی جناب رحیم قریشی جنرل سیکرٹری مجلس تعمیر ملت تھے۔ امیر محترم جب خطاب فرمانے کے لئے ڈائس پر تشریف لائے نہ صرف یہ کہ ہال مکمل طور پر بھر چکا تھا بلکہ اس سے ملحق تمام گیلریز بھی بھر چکی تھیں۔ اور بہت سے لوگ باہر کھڑے ہو کر آپ کے خطاب کو سن رہے تھے۔ یہاں آپ نے قریباً سوا دو گھنٹہ "امت مسلمہ کے ماضی" پر مفصل اظہارِ خیال فرمایا۔ لوگوں کی دلچسپی آخر وقت تک برقرار رہی۔

ہم یہاں سے فارغ ہو کر قریباً سوا پانچ بجے اپنی قیام گاہ پہنچے۔ عصر کی نماز ادا کی نماز مغرب کے بعد فلورا اپارٹمنٹ کے میٹنگ ہال میں "اسلام کے معاشی نظام" کے موضوع پر ایک خصوصی

نشست تھی جس میں شرکت دعوت نامہ کے ذریعہ تھی اس نشست میں شہر کے قریباً سو اعلیٰ تعلیم یافتہ مرد و خواتین جمع تھے۔ اس میں آپ نے وضاحت سے "اسلام کے معاشی نظام" پر روشنی ڈالی اور اس کے مختلف پہلوؤں کو وضاحت سے بیان فرمایا۔ سامعین میں معاشیات کے پروفیسر حضرات بھی شامل تھے۔ تقریر کے بعد عشاء کی نماز باجماعت ادا کی گئی اور اس کے بعد ڈنر کا اہتمام تھا۔ ڈنر کے اختتام پر آج کی تقریر سے متعلق سوال و جواب کی محفل جمی جس میں کئی نہایت اہم ٹھوس علمی سوالات سامنے آئے۔ جن کے امیر محترم نے وضاحت سے جوابات دیئے۔ ابھی کچھ سوالات باقی تھے کہ اس نشست کو برخواست کرنا پڑا کیونکہ رات کافی ہو چکی تھی۔

۱۶ر اکتوبر بروز پیر

آج کا دن امیر محترم کے لئے نسبتاً ہلکا تھا۔ صبح کے وقت ملاقات کے لئے آنے والے حضرات کے لئے طے تھا جس میں خاص طور پر محترم سلیمان سکندر صاحب اور رحیم قریشی صاحب شامل تھے ان حضرات سے امیر محترم کی دو ڈھائی گھنٹہ تک خصوصی نشست رہی جس میں مختلف موضوعات زیر گفتگو آئے۔

ظہر کی نماز کے بعد آرام کا موقعہ ملا۔ عشاء تک کوئی اور مصروفیت نہیں تھی۔ آج بعد نماز عشاء پرکاشم ہال گاندھی بھون میں "امت مسلمہ کا حال" کے عنوان پر امیر محترم کا خطاب تھا۔ آج منتظمین نے چار ہزار افراد کے بیٹھنے کے لئے انتظامات کئے تھے۔ جلسہ کی صدارت آج محترم سید مکثو شاہ صاحب سابق صدر نشین قانون ساز کونسل فرما رہے تھے جبکہ مہمان خصوصی صدر مجلس تعمیر ملت سید سلیمان سکندر صاحب تھے۔ امیر محترم کے خطاب سے قبل ہی تمام نشستیں پر ہو چکی تھیں اور مزید آنے والے لوگوں کے لئے کھڑے ہونے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ خطاب اس قدر اثر انگیز تھا کہ لوگوں کا یہ جم غفیر پوری دلچسپی اور انتہائی صبر و سکون سے آپ کا خطاب سنتا رہا۔ آج چونکہ "امت مسلمہ کا حال" کے موضوع پر خطاب ہو رہا تھا تو لامحالہ اس کے ضمن میں عصری تحریکوں کا معروضی تجزیہ بھی پیش کرنا پڑا جو کہ صرف اظہار حقیقت اور خود احتسابی کے لئے تھا اس میں نہ کسی کی توہین مقصود تھی اور نہ ہی تحقیر کا کوئی پہلو تھا۔ سامعین نے بحث مجموعی امیر محترم کے تجزیے سے اتفاق کیا اور اسے خود احتسابی کے لئے مفید قرار دیا لیکن یہ بے لاگ تجزیہ بعض حضرات پر قدرے گراں گذرا۔

امیر محترم کے قریباً دو گھنٹہ کے خطاب کے بعد آج کے صدر مجلس محترم مکثو شاہ صاحب نے صدارتی کلمات ارشاد فرمائے جس میں انہوں نے آپ کے خطاب کو بے حد سراہا اور آپ کی دعوت رجوع الی القرآن کی تحریک اور اس میں آپ کے کردار پر روشنی ڈالی۔ ذیل میں جناب مکثو شاہ صاحب کے خطاب کو کیسٹ سے اتار کر ہدیہ قارئین کیا جا رہا ہے۔

صدر مجلس سید مکثر شاہ، سابق صدر نشین قانون ساز کونسل کے تاثرات

مولانا ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کو سننے کے لئے یہاں حاضر ہوا تھا لیکن اس کا اندازہ نہیں تھا کہ یہاں مجھے اپنے خیالات کا اظہار بھی کرنا پڑے گا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ مولانا اسرار احمد صاحب کی تقریر کے بعد میں زیادہ وقت لینا نہیں چاہتا۔ لیکن سب سے پہلے میں خدام القرآن کے صدر اور ارکان کا انتہائی مشکور ہوں کہ انہوں نے مجھے آج کے اس جلسے میں مدعو کیا۔ میں یہاں پر شرکت کو اپنے لئے سعادت سمجھتا ہوں اور آپ حضرات بھی چودہ تاریخ سے آج تک مختلف عنوانات پر مولانا کے خیالات کو سن رہے ہیں۔ مجھے اس سے پہلے بیرونی ممالک میں مختلف مقامات پر خواہ وہ امریکہ ہو خواہ کینیڈا ہو، متحدہ عرب امارت ہو یا جدہ ہو، مکہ معظمہ ہو یا مدینہ شریف ہو مجھے جہاں بھی جانے کا موقع ملا، میں نے وہاں مولانا کے درس قرآن کے کیسٹ کے بارے میں سنا اور مجھے انتہائی خوشی ہوئی کہ دنیا کے مختلف ممالک کے بڑے بڑے شہروں میں ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں تعلیم یافتہ لوگوں میں مولانا کے آڈیو اور وڈیو کیسٹس کو سننے کے بعد وہاں پر قرآن کو سمجھنے کی جو بات پیدا ہوئی ہے اور اتنی مصروف زندگی کے باوجود قرآن کو سمجھنے کی جو لگن پیدا ہوئی ہے اس وجہ سے میں سمجھتا ہوں کہ ان لوگوں کا دینی شعور بلند ہو رہا ہے۔ اس کی سب سے اہم وجہ جسے عام طور پر آپ محسوس کرتے ہوں گے یہ ہے کہ جہاں کہیں بھی مولانا اسرار جاتے ہیں وہاں کی محفلوں میں تعلیم یافتہ افراد کثیر تعداد میں ہوتے ہیں اور غیر تعلیم یافتہ بھی ہوتے ہیں۔ اسی طرح ٹیکنیکل کورسز سے جن کا تعلق ہوتا ہے وہ بھی ہوتے ہیں۔ بڑی خوشی کی بات یہ ہے اور آپ کو خود بھی اس کا اندازہ ہے کہ خواہ یہاں کے بچے ہوں یا پاکستان کے نوجوان ہوں جو دوسرے ممالک میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں یہ سب تعلیم یافتہ نوجوان ہیں جو اس تحریک سے متاثر ہو رہے ہیں۔ یقین مانئے کہ ہمیں مایوسی نہیں بلکہ اس دور انحطاط میں بھی امید کی کرن دکھائی دیتی ہے۔

ابھی مولانا نے اپنی تقریر میں بہت ساری چیزوں کے متعلق فرمایا۔ میں دو نکات کے تعلق سے عرض کرتے ہوئے آپ سے رخصت چاہوں گا۔ اسلام محض مذہب نہیں بلکہ دین ہے۔ اگر اس کے تعلق سے سوچیں تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ آنے والے دنوں میں ہمیں کسی ایک ملک کی حد تک یا کسی ایک ایریا کی حد تک رہنمائی نہیں کرنی ہے بلکہ ساری دنیا کی رہنمائی کرنی ہے۔ اسی وجہ سے جب مجھے مدعو کیا گیا تو میں نے اپنی خوش قسمتی سمجھی کہ میں یہاں شرکت کر رہا ہوں اور مجھے مولانا کو سننے کا موقع مل رہا ہے۔ جب تک کہ کوئی مسلمان عصری تعلیم سے واقف نہ ہو وہ اپنے محدود ماحول میں بھی قیادت نہیں کر سکے گا تو کیسے ہم توقع کر سکتے ہیں کہ آج کی اس ترقی یافتہ دنیا میں خواہ وہ امریکہ ہو یا روس ہو، ان کو ہم اپنی تعلیمات

بہم پہنچاتے ہوئے ان کی قیادت کرنے کے قابل ہو سکیں گے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہمارے پاس علماء دین بہت ہیں۔ ان میں بہت کم ایسے ہیں جو عصری تعلیم سے بھی نوازے گئے ہوں اور قرآنی تعلیم سے بھی نوازے گئے ہوں۔ لیکن یہ حقیقت ہے آج کی اس محفل میں میں دیکھ رہا ہوں کہ یہاں ۔ینائرڈ سول آفیسرز بھی ہیں' ڈاکٹرز بھی ہیں' اور انجینئرز بھی ہیں۔ اس کی وجہ کیا ہے کہ گاندھی بھون پر کاشم ہال آج کھچا کھچ بھرا ہوا ہے۔ خواتین بھی بڑی تعداد میں موجود ہیں اور آپ حضرات بھی ہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ آج کے ترقی یافتہ دور میں جو سائنٹفک دور ہے' کمپیوٹر کا دور ہے اس ماحول میں جدید دور کی اصطلاحات میں اگر دین سمجھایا جائے تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے۔ مولانا کی تقریر سے قبل ایک خاتون نے چٹھی لکھ بھیجی کہ آپ کی تقریر میں دقیق الفاظ ہوتے ہیں جسے سمجھنے سے ہم قاصر ہیں۔ میں کہوں گا کہ وہ الفاظ دقیق نہیں بلکہ اصل معاملہ یہ ہے کہ موجودہ دور کی تعلیم اور پرانے دور کی تعلیم کے درمیان بہت بڑا خلا پیدا ہو گیا ہے۔ اسی وجہ سے ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے اپنے جو علماء اور دینی رہنما ہیں وہ آج کے ماحول کا جائزہ لیتے ہوئے دور حاضر کی تعلیمات سے آج کی نئی پود کو سرفراز کریں۔ میں ایک اور نکتے کے تعلق سے جو مولانا نے کہا کچھ عرض کروں گا۔ جیسا کہ میں نے بیرونی ممالک میں محسوس کیا کہ نوجوان طلبہ ہوں یا وہاں پر بڑی بڑی ملازمتوں پر جو لوگ فائز ہیں اور ایک ایک انسٹی ٹیوٹ کو چلاتے ہیں' انہوں نے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے وڈیو اور آڈیو کیسٹس کے بارے میں بتایا کہ ہم ہر روز اتنا وقت نکال لیتے ہیں کہ قرآن کریم کو سامنے رکھ کر ڈاکٹر صاحب کے دورہ ترجمہ قرآن کے کیسٹ سنتے ہیں۔ ہمارا مطالعہ قرآن اس طرح ہوتا ہے' اور آپ لوگ ہمارے بارے میں یہ رائے قائم کرتے ہیں گویا ہم دینی موضوعات پر ریسرچ کرتے ہوں گے۔ یقین مانئے وہاں کی بہت سی محفلوں میں شرکت کرنے کا موقعہ ملا اور انفرادی لوگوں سے بات چیت کرنے کا موقع بھی ملا تو میں نے ان سے کہا میں نے یہاں محسوس کیا کہ یہاں شاید بہت سے ۔ینی تعلیمی ادارے کام کر رہے ہوں گے تبھی یہاں کے لوگ اتنی معلومات سے سرفراز ہیں۔ انہوں نے کہا یہ ویڈیو کیسٹس کا نتیجہ ہے۔ جب کبھی بھی ہم کو وقت ملتا ہے ہم سنتے ہیں اور اسی وجہ سے ہم کو یہ معلومات ہیں۔ اسی وجہ سے میں انجمن خدام القرآن انڈیا کے صدر اور اراکین کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور دلی مبارکباد دیتا ہوں کہ انہوں نے یہاں

پر چودہ تاریخ سے سترہ تاریخ تک مولانا کے دروس قرآن اور خطبات کا جو اہتمام کیا اس پر ہم آپ کے ممنون ہیں اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ مولانا کی عمر دراز ہو اور اسی طرح سے آپ کے خطبات اور دروس سے ہم سب فیض یاب ہوتے رہیں ۔ خدا حافظ

۱۷ر اکتوبر بروز منگل

آج صبح نو بجے امیر محترم کی اردو روزناموں کے نمائندوں سے پریس کانفرنس طے تھی جس میں خاص طور پر روزنامہ سیاست ' روزنامہ منصف اور روزنامہ رہنمائے دکن کے نمائندوں نے آپ سے کافی سوالات کئے اور آپ کے قرآنی انقلابی فکر اور آپ کے طریقہ کار کو سمجھنے کی کوشش کی ۔ یہ نشست ظہر کی نماز تک جاری رہی آج انجمن خدام القرآن انڈیا کے معتمد محترم حیدر محی الدین غوری صاحب نے امیر محترم کے اعزاز میں پر تکلف ظہرانہ کا اہتمام کر رکھا تھا جس میں انجمن کے جملہ ارکان کے علاوہ شہر کے معزز حضرات بھی مدعو تھے ۔

عصر کی نماز کے بعد مولانا آزاد ریسرچ انسٹیٹیوٹ باغ عامہ کے ہال میں "مولانا آزاد مرحوم کی زندگی اور کارنامے" کے عنوان سے خطاب تھا ۔ جس میں آپ نے ۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۰ء تک کے مولانا آزاد کا بھر پور تعارف کروایا اور داعی الی القرآن کے طور پر مولانا کے خصوصی مقام کو بیان فرمایا ۔ یہ نشست مغرب کی نماز تک جاری رہی ۔

آج بعد نماز عشاء ساڑھے آٹھ بجے شام امیر محترم کے حالیہ دورہ حیدر آباد کا آخری خطاب تھا ۔ آج کے لئے "امت مسلمہ کا مستقبل میں لائحہ عمل" کا عنوان تجویز کیا گیا تھا ۔ جو کہ پرکاشم ہال گاندھی بھون میں ہی تھا ۔ آپ کی پچھلی دو تقاریر کی وجہ سے لوگوں میں اس موضوع سے دلچسپی اپنے عروج پر تھی اور وہ سامعین جو پرکاشم ہال میں گذشتہ دو خطابات سن چکے تھے ۔ آج کے موضوع کی اہمیت کے پیش نظر اپنے دوستوں کو بھی ساتھ لانے کا پروگرام بنا رہے تھے ۔ اس صورت حال سے انتظامیہ بھی اچھی طرح واقف تھی ۔ اس لئے منتظمین نے آج پانچ ہزار افراد کے لئے نشستوں کا انتظام کیا تھا اور ہال سے باہر کلوز ڈی وی سرکٹ کے ذریعہ کئی ٹی وی سیٹ لگائے گئے تھے تاکہ وہ سامعین جو کہ ہال سے باہر تھے وہ امیر محترم کی تقریر سے پورے طور پر مستفید ہو سکیں ۔ الحمد للہ آج بھی حاضری اتنی تھی کہ یہ تمام انتظامات بھی ناکافی ثابت ہوئے ۔ اور ایک کثیر تعداد میں لوگوں کو کھڑے ہو کر تقریر کی سماعت کرنا پڑی ۔

آج کے جلسہ کے صدر محترم جناب محبوب حسین جگر صاحب ایڈیٹر روزنامہ سیاست تھے ۔ جبکہ مہمان خصوصی محترم ڈاکٹر حسن الدین احمد صاحب ای اے ایس تھے ۔ آج حاضرین کی تعداد اور ان کے جذبہ لقاء مصافحہ کو دیکھتے ہوئے اندازہ ہوا کہ اگر اس بات کی اجازت دی گئی کہ لوگ آپ

سے مصافحہ کریں تو رات کے تین بج جائیں گے۔ اس لئے منتظمین نے اس بات کا انتظام کیا کہ امیر محترم کو دوسرے گیٹ سے باہر نکالا جائے جہاں انہوں نے خصوصی طور پر ایک گاڑی کا بندوبست کر رکھا تھا۔ جس کی وجہ سے امیر محترم بہ آسانی رات ساڑھے گیارہ بجے اپنی قیام گاہ پر پہنچ گئے۔

۱۸ راکتوبر بروز بدھ

آج امیر محترم کے قیام حیدر آباد کا آخری دن تھا۔ اس مناسبت سے آج سوال و جواب کی نشست ہماری قیام گاہ فتح منزل احمد نگر پر رکھی گئی تھی اور اس کے لئے صبح ۹ بجے کا وقت متعین تھا۔ مگر لوگ صبح ۸ بجے ہی سے جمع ہونے شروع ہو گئے۔ نو بجے تک قریباً ۱۵۰ افراد جمع ہو چکے تھے۔ ۹ بجے سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا۔ لوگوں نے تحریری سوالات پہلے سے جمع کروا دیئے تھے۔ امیر محترم نے ترتیب وار ان کے جوابات دینے شروع کئے۔ قریباً پونے بارہ بجے تک سلسلہ جاری رہا۔ اس کے بعد یہ محفل برخاست ہوئی۔ بعد ازاں امیر محترم نے انجمن خدام القرآن انڈیا کی صدارت کے لئے رفقاء سے مشورہ کیا اور محترم قاری عبدالعلیم صاحب کو صدر منتخب فرمایا۔ قاری صاحب کو یہ منصب پہلے بھی حاصل تھا۔ اس طرح اب وہ اگلی مدت کے لئے بھی صدر منتخب ہو گئے ہیں۔ دعا ہے کہ رب کریم ان کی معاونت فرمائیں اور ان کی سربراہی میں انجمن اپنے اغراض و مقاصد میں آگے سے آگے بڑھتی چلی جائے۔ اور ان کے رفقاء کو ان کے ساتھ بھرپور تعاون کرنے کی توفیق عطا فرمائیں (آمین)

امیر محترم بنگلور جانے کی غرض سے یہاں سے ایک بجے جملہ احباب و رفقاء کی معیت میں ایئر پورٹ روانہ ہوئے۔ بنگلور میں تین دن یعنی ۱۸ تا ۲۰ راکتوبر کا پروگرام طے تھا۔ اس سفر میں انجمن خدام القرآن انڈیا کے معتمد محترم حیدر محی الدین غوری صاحب آپ کے ساتھ تھے۔

میں ایک دن کے لئے حیدر آباد میں رک گیا کیونکہ میری دہلی روانگی ۱۹ راکتوبر کی صبح ۷ بجے اے۔ پی۔ ایکسپریس سے تھی۔ اس لئے مجھے اپنے اعزہ و اقربا سے ملاقات کرنے اور ایک دن میں شہر گھوم پھر کر دیکھ لینے کا موقع مل گیا۔ ہمارے قیام حیدر آباد میں رفقاء و احباب نے جس طرح محبت و الفت اور اخلاص و خلوص کا مظاہرہ کیا اس کا اجر تو ان حضرات کو اللہ پاک کے یہاں سے ملے گا ہی لیکن ان حضرات کا شکریہ ادا نہ کرنا سخت نامروتی و ناانصافی ہو گا۔ خاص طور پر محترم محمد جعفر صاحب کا کہ جنہوں نے ہمارے قیام و طعام کے انتظام کے علاوہ آمد و رفت کے لئے اپنی دو گاڑیاں ہمارے تصرف میں دیدیں بلکہ خود بھی تمام عرصہ ہمارے ساتھ رہے اور اپنی تمام مصروفیات کو معطل رکھا۔ ان کی والدہ محترمہ اور والد صاحب و بھائی صاحب اور اہلیہ محترمہ نے بھی ہمارے آرام کا بہت خیال رکھا۔ ان کے ساتھ ساتھ محترم حیدر محی الدین غوری صاحب اور میر قطب الدین علی چشتی صاحب، مہدی علی خان صاحب، قاری تقی الدین صاحب، حافظ نصیر علی صاحب بھی اپنی تمام

مصروفیات ترک کر کے امیر محترم کے ساتھ رہے اور پروگراموں کی ترتیب اور انتظامات میں مصروف رہے۔ امیر محترم کے دورہ کے پروگراموں کو اخبارات کے ذریعے عوام تک پہنچانے میں محترم میر قطب الدین علی چشتی صاحب نے حقیقت یہ ہے کہ اپنی صلاحیتوں کا بھر پور مظاہرہ کیا۔ ان کے فرزندوں نے اشتہارات لکھوانے اور پریس ریلیز اخبارات کو دینے میں جس بھاگ دوڑ کا مظاہرہ کیا وہ ہمارے لئے ایک نمونہ ہے۔ اس طرح حیدر آباد دکن کے اردو اخبارات ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے امیر محترم کی آمد اور قیام کے دوران بڑے بڑے اشتہارات مفت شائع کئے اور امیر محترم کی تقاریر کو بھر پور کوریج دیا۔ اللہ تعالیٰ انہیں اس کا اجر جزیل عطا فرمائیں۔ آمین

امیر محترم ۱۸ر اکتوبر بروز بدھ ڈھائی بجے حیدر آباد دکن سے بذریعہ ہوائی جہاز بنگلور روانہ ہوئے اور اللہ کے فضل و کرم سے سوا تین بجے بنگلور پہنچے۔ وہاں ایئر پورٹ پر جو حضرات استقبال کے لئے موجود تھے ان میں مولانا سید مصطفیٰ رفاقی صاحب، نور محمد خالد صاحب، صدیق محمد جعفری صاحب، محمد سعید صاحب، سید بلال ظہیر صاحب، ذکی عبد اللہ صاحب، سعادت اللہ خان صاحب، امیر صالح صاحب، اور فیروز عبد اللہ صاحب، شامل تھے۔ امیر محترم کو شہر کے قلب میں واقع ایک ہوٹل میں ٹھہرایا گیا۔ اسی روز شام کو "گرونانک بھون" میں بعد نماز مغرب "حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ابدی معجزہ: قرآن حکیم" کے موضوع پر امیر محترم نے مدلل خطاب فرمایا۔ قریباً دو ہزار مرد و خواتین نے اس پروگرام میں شرکت کی۔

۱۹ر اکتوبر بروز جمعرات

صبح ناشتہ سے فارغ ہو کر ساڑھے آٹھ بجے امیر محترم بارہ افراد کے قافلہ کے ساتھ میسور کے لئے روانہ ہوئے۔ کیونکہ وہاں بعد نماز ظہر مدرسہ صدیقیہ میں طلبہ سے "عظمت قرآن" کے موضوع پر خطاب فرمانا تھا۔ راستہ میں ٹیپو سلطان کا مزار اور اس سے متصل ٹیپو سلطان کی مسجد دیکھنے کا موقع بھی ملا۔ طلبہ سے خطاب کرنے کے بعد اے۔ کے عبد الصمد صاحب کے مکان پر، جو شہر کے ذی اثر آدمی ہیں، ظہرانہ میں شرکت فرمائی اور پھر شام ساڑھے چھ بجے کے لگ بھگ بنگلور واپس پہنچ گئے

اسی شام ساڑھے سات بجے ہوٹل کاویری کانٹی نینٹل کے ہال میں

"Prophet Mohammad : A Mercy for Mankind"

کے موضوع پر انگریزی میں خطاب فرمایا۔ جس میں مسلم مرد و خواتین کے علاوہ غیر مسلم حضرات بھی کافی تعداد میں موجود تھے۔ تمام حضرات نے انتہائی دلجمعی اور ہمہ تن گوش ہو کر آپ کا خطاب سنا۔ امیر محترم خطاب کے بعد محترم صدیق محمد جعفری صاحب کے مکان پر تشریف لے گئے۔ جہاں جعفری صاحب نے آپ کے اعزاز میں ایک پر تکلف عشائیہ کا اہتمام کیا ہوا تھا جس میں قریباً شہر کے ۲۵ معزز حضرات بھی مدعو تھے۔ یہاں ان حضرات نے امیر محترم سے قرآن کی

انقلابی دعوت کو سمجھنے کے لئے کچھ سوالات بھی کئے ۔ اور بڑے ہی بے تکلفانہ ماحول میں رات دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔

۲۰ر اکتوبر بروز جمعہ

آج جمعہ کی نماز سے قبل بنگلور کی مسجد اسلام آباد میں امیر محترم نے حاضرین جمعہ سے قریباً ایک گھنٹہ خطاب فرمایا۔ نماز جمعہ کی ادائیگی کے بعد دہلی روانگی کی غرض سے سیدھے ایئرپورٹ پہنچے۔ محترم حیدر محی الدین غوری صاحب آپ کے ہمراہ تھے ۔ جہاز کی روانگی میں تاخیر ہوئی چنانچہ رات ساڑھے نو بجے دہلی پہنچے ۔ میں پہلے ہی حیدر آباد دکن سے سیدھا دہلی پہنچ چکا تھا اور محترم رضوان عابد قریشی صاحب کے ہاں مقیم تھا۔ ہم ایک غلط فہمی کی وجہ سے ایئرپورٹ نہ پہنچ سکے ۔ جس کی وجہ سے امیر محترم اور غوری صاحب کو تشویش ہوئی۔ امیر محترم ایئرپورٹ سے سیدھے محترم رضوان عابد قریشی صاحب کے مکان پر پہنچے۔ امیر محترم اور غوری صاحب کے قیام کا انتظام Five Star Guest House میں کیا گیا تھا۔ امیر محترم کی آمد پر میں بھی وہیں منتقل ہو گیا۔

۲۱ر اکتوبر بروز ہفتہ

صبح نماز اور ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ محترم مولانا اخلاق حسین قاسمی صاحب اور مولانا اختر ہاشمی صاحب مدظلہ تشریف لے آئے اور قریباً دو گھنٹہ ساتھ رہے۔ اس کے بعد امیر محترم، غوری صاحب اور میں ایک ٹیکسی کے ذریعہ کاندھلہ کے لئے روانہ ہوئے۔ ابھی ہم قریباً ۷۵ کلو میٹر گئے ہوں گے کہ ایک بڑے حادثے سے اللہ نے ہمیں بچایا۔ ہوا یہ کہ ہماری گاڑی کا بریک فیل ہو گیا جبکہ آگے چلتی بس نے ہم سے صرف چند گز کے فاصلہ پر بریک لگا دیا۔ ڈرائیور نے بمشکل تمام گاڑی کو بس کے ساتھ ٹکرانے سے بچایا تو سامنے ایک ٹرک آ گیا اور ہماری گاڑی تھی کہ رک ہی نہیں رہی تھی اور نہ ہی گاڑی کا گیئر تبدیل ہو رہا تھا۔ ڈرائیور انتہائی سمجھ دار اور ہوشیار تھا وہ اس صورت حال میں حواس باختہ نہ ہوا بلکہ انتہائی سمجھ داری سے اس نے گاڑی کو ٹرک سے بچاتے ہوئے سڑک سے اتار لیا اور بڑی ہی مہارت سے سڑک کے ساتھ ساتھ لگے ہوئے درختوں سے بچاتا ہوا قریباً ایک فرلانگ کے فاصلے پر گاڑی کو روکنے میں کامیاب ہو گیا۔ بس کے مسافر اور اسٹاپ پر کھڑے ہوئے حضرات ہماری طرف سے مایوس ہو چکے تھے ۔ مگر بچ جانے پر وہ بھی حیران تھے ۔ اور یوں ہمیں ایک نئی زندگی ملی۔

آج سے قریباً سات ماہ قبل بھی امیر محترم کو ابوظہبی سے دوبئی آتے ہوئے ایک ایسا ہی حادثہ پیش آیا تھا۔ مگر اس میں بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے بچا لیا تھا۔ دلی دعا ہے کہ رب کریم امیر محترم کو صحت و عافیت کے ساتھ طویل عمر عطا فرمائیں، اور اپنے دین کی خدمت کی زیادہ سے زیادہ توفیق عطا فرمائیں۔ (آمین یارب العالمین) ڈرائیور نے گاڑی کا بریک صحیح کیا اور قریباً پون

گھنٹہ بعد ہم آگے روانہ ہوئے۔ سوا بجے ہم کاندھلہ پہنچے۔ جہاں امیر محترم نے مولانا نور الحسن راشد صاحب سے ملاقات کی۔ مولانا موصوف کی امیر محترم سے قریباً دو سال سے بعض مسائل پر خط و کتابت چل رہی تھی اور یہ ملاقات اسی ضمن میں تھی۔ باہم مفصل تبادلہ خیالات ہوا۔ مولانا محترم نے نہایت مختصر وقت میں ہمارے ظہرانہ کا اہتمام کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے انواع و اقسام کے کھانے تیار کروا کے دستر خوان پر چن دئے جنہیں دیکھ کر بھوک بھی چمک اٹھی۔ کھانے اور ظہر کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد مولانا نور الحسن راشد صاحب کی معیت میں حسین پور کے لئے روانہ ہوئے۔

امیر محترم کے پڑدادا حسین پور ہی کے رہنے والے تھے اور جس حویلی میں وہ رہا کرتے تھے اسے "پکی حویلی" کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد انگریز نے ان سے یہ حویلی ضبط کر لی تھی اور موصوف کو یہاں سے جلاوطن ہونا پڑا تھا' امیر محترم اس حویلی کو دیکھنا چاہتے تھے۔ مولانا نور الحسن صاحب ہمارے رہبر تھے۔ مگر ایک جگہ موڑ کاٹنے میں غلطی ہو گئی اور ہم حسین پور کی بجائے حسن پور پہنچ گئے۔ آخر دریافت کرتے ہوئے حسین پور پہنچے۔ امیر محترم نے بالآخر وہ حویلی تلاش کر لی اور اس کو اندر باہر سے دیکھا اور اس کے ساتھ محترم الطاف حسن قریشی مدیر اردو ڈائجسٹ کے دادا کی حویلی بھی دیکھی جو کہ "کچی حویلی" کہلاتی تھی۔ یہاں سے فارغ ہو کر امیر محترم جلد از جلد دہلی پہنچنا چاہتے تھے۔ کیونکہ بعد نماز عشاء چوک جامع مسجد دہلی میں "جلسہ سیرت النبی" سے آپ کو خطاب فرمانا تھا۔ ہم اللہ کے فضل و کرم سے شام سوا آٹھ بجے دہلی پہنچ گئے۔

میں اور غوری صاحب اس سفر کی وجہ سے تھک گئے تھے اور عشاء کی نماز پڑھ کر سو جانا چاہتے تھے جبکہ امیر محترم فوراً تقریر کے لئے تیار ہو گئے تو ہم کو ان کی ہمت پر رشک آیا کہ ان کے اندر اللہ رب العزت نے کتنی تڑپ اور جذبہ رکھا ہوا ہے کہ اپنے سکون و آرام کو تج کر وہ قرآن کے انقلابی فکر کو مخلوقِ خدا تک پہنچانے کے لئے سرگرم عمل ہیں۔ غوری صاحب اور میں جلسہ گاہ میں کچھ تاخیر سے پہنچے۔ امیر محترم کا خطاب شروع ہو چکا تھا اور لوگ ہمہ تن گوش آپ کا خطاب سن رہے تھے۔ اور چونکہ یہ جلسہ ایک چوک پر ہو رہا تھا اس لئے راہ چلتے غیر مسلم بھی ایک لمحہ کے لئے رک کر تقریر سنتے اور پھر سنتے ہی رہ جاتے۔ آپ کا خطاب قریباً ساڑھے دس بجے ختم ہوا۔

۲۲ر اکتوبر بروز اتوار

آج صبح ہی سے امیر محترم کی طبیعت کچھ ناساز تھی اور معمولی حرارت بھی تھی جس کی وجہ کل کا لمبا سفر اور پھر رات کی تقریر تھی۔ آج چونکہ درس یا تقریر کا کوئی پروگرام بھی نہیں تھا اس لئے قریباً سارا دن امیر محترم نے آرام فرمایا۔ عصر کے وقت تک طبیعت اعتدال پر آ گئی۔ آج اے۔ پی ایکسپریس کے ذریعہ محترم حیدر محی الدین غوری صاحب حیدر آباد دکن واپس تشریف لے گئے۔ موصوف نے جس عقیدت و محبت سے امیر محترم کی خدمت کی وہ اپنی مثال آپ ہے۔

محترم حیدر محی الدین غوری صاحب کے حیدر آباد واپس تشریف لے جانے کے بعد امیر محترم نے مجھے اور رضوان عابد قریشی صاحب کو ریلوے کے بکنگ آفس روانہ کیا تا کہ لکھنو کے لئے دو سیٹوں کی بکنگ کرائی جاسکے۔ مگر بد قسمتی میری سمجھئے کہ کسی بھی ٹرین میں کوئی سیٹ بھی نہ مل سکی۔ جس کی وجہ یہ بتلائی جارہی تھی کہ الیکشن کا اعلان ہو چکا ہے اور لوگ پارٹی ٹکٹ کے حصول کے لئے سر گرم عمل ہیں۔ واپس آ کر امیر محترم کو اس صورت حال سے مطلع کیا گیا تو آپ نے مجھے دہلی ٹھہرنے کا حکم دیا اور رضوان صاحب کو ہدایت فرمائی کہ ہوائی جہاز سے ایک سیٹ کے بک کروانے کا اہتمام کریں۔ الحمد للہ کہ اگلی صبح ۶ بجے کی فلائٹ میں ایک سیٹ مل گئی۔

۲۳ر اکتوبر بروز پیر

صبح ساڑھے چار بجے امیر محترم ایئر پورٹ کے لئے روانہ ہوئے۔ جہاز قدرے تاخیر سے روانہ ہوا لہٰذا لکھنو پہنچے ۹ بج گئے۔ ندوۃ العلماء لکھنو میں حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی مدظلہ آپ کے منتظر تھے۔ یہاں سے طے شدہ پروگرام کے مطابق مولانا علی میاں امیر محترم کو اپنی رہائش گاہ واقع "تکیہ شاہ عالم" لے گئے' تا کہ پر سکون ماحول میں گفتگو ہو سکے۔ دونوں حضرات نے مختلف مسائل پر تبادلہ خیال کیا۔ مولانا علی میاں نے کمال شفقت سے یہ پورا وقت امیر محترم کے لئے خاص کر لیا تھا۔ رات کو امیر محترم واپس ندوۃ العلماء تشریف لے آئے اور رات وہیں بسر کی۔

۲۴ر اکتوبر بروز منگل

صبح ناشتہ کے بعد امیر تنظیم مولانا افتخار احمد فریدی مدظلہ سے ملاقات کی غرض سے بذریعہ ٹرین مراد آباد کے لئے روانہ ہوئے۔ قارئین "میثاق" مولانا موصوف سے اچھی طرح واقف ہیں آپ کے ملت کے درد میں ڈوبے ہوئے فکر انگیز خطوط گاہے بگاہے میثاق و حکمت قرآن کی زینت بنتے رہتے ہیں۔ امیر محترم چار گھنٹہ کا سفر طے کر کے مولانا کے پاس پہنچے۔ مولانا کو امیر محترم کے مراد آباد آنے کی اطلاع نہیں تھی۔ وہ اس اچانک ملاقات پر بہت خوش نظر آرہے تھے۔ مولانا امیر محترم سے بے پناہ محبت رکھتے ہیں بلکہ انہیں دنیا کے ہر اس شخص سے انتہائی تعلق خاطر ہوتا ہے جو دین کی خدمت میں معروف ہو اور قرآن کی دعوت کو عام کرنے میں سر گرم عمل ہو۔ خواہ اس کا تعلق روئے ارضی کے کسی خطے سے ہو۔ ڈھائی گھنٹے کی مختصر سی ملاقات میں بہت سے موضوعات زیر گفتگو آئے۔ نماز ظہر اور کھانے سے فراغت کے بعد امیر محترم مولانا سے بدقت تمام رخصت لے کر بذریعہ بس دہلی کے لئے روانہ ہوئے۔ اور قریباً ساڑھے چھ گھنٹے کے مشقت آمیز سفر کے بعد دہلی پہنچے۔

۲۵ر اکتوبر بروز بدھ

آج امیر محترم کا پروگرام اپنی جائے پیدائش 'حصار' جانے کا تھا۔ یہ دہلی سے قریباً ایک سو میل

کے فاصلے پر مشرقی پنجاب میں صوبہ ہریانہ کا ایک شہر ہے۔ علی الصبح ہی آپ اپنے عزیز رضوان عابد قریشی کے ہمراہ بذریعہ بس حصار کے لئے روانہ ہوئے۔ میں حصار جانے سے اس لئے معذور تھا کہ مجھے وہاں کا ویزہ نہیں ملا تھا۔ امیر محترم نے میٹرک تک تعلیم وہیں حصار ہی میں حاصل کی تھی۔ اور پھر بوقت تقسیم ہجرت کر کے اپنے والدین اور اعزہ کے ہمراہ پاکستان پہنچے تھے۔ حصار میں امیر محترم نے اس مکان کو بھی دیکھا جہاں آپ کی پیدائش ہوئی تھی۔ وہ ابھی تک اپنی پرانی بنیادوں پر قائم تھا اور اس کی ہیئت میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں آئی تھی۔ اب وہاں ایک ہندو خاندان آباد تھا۔ انہوں نے امیر محترم کا اکرام کیا اور اہتمام سے پورا مکان انہیں دکھایا۔ شام پانچ بجے آپ دہلی واپس پہنچ گئے۔ آج بعد نماز عشاء ایک مسجد میں خطاب عام تھا۔ یہ تقریب ایک دینی مکتب کے افتتاح کی مناسبت سے منعقد کی گئی تھی۔

۲۶ر اکتوبر بروز جمعرات

آج ہماری ہندوستان سے روانگی کا دن تھا۔ صبح ہی ہم سامان کی پیکنگ سے فارغ ہو گئے۔ آج بعد نماز فجر مولانا اخلاق حسین قاسمی صاحب مدظلہ کی امیر محترم سے ملاقات طے تھی مگر مولانا بعض مصروفیات کی وجہ سے تشریف نہ لا سکے۔ ۹ بجے صبح امیر محترم جماعت اسلامی ہند کے صدر دفتر تشریف لے گئے۔ وہاں امیر جماعت اسلامی ہند مولانا ابواللیث صاحب نے امیر محترم کا خیر مقدم فرمایا۔ دیگر ذمہ دار حضرات بھی موجود تھے۔ قریباً ایک گھنٹہ تک امیر محترم نے امیر جماعتِ اسلامی ہند سے تبادلۂ خیال فرمایا۔ اس کے بعد جامعہ رحیمیہ کے لئے روانہ ہوئے۔ یہاں مدرسہ کے سرپرست محترم شیر میوات علی محمد صاحب نے ایک تقریب کا اہتمام کر رکھا تھا۔ جس میں امیر محترم کی دستار بندی کی گئی۔ قارئین کو یاد ہو گا کہ آج سے قریباً چار سال قبل بھی اس مدرسہ میں موصوف کی دستار بندی ہوئی تھی۔ یہاں آپ نے نماز ظہر سے قبل طلبہ و اساتذہ کرام سے قریباً ڈیڑھ گھنٹہ خطاب فرمایا۔ نماز ظہر کے بعد شیر میوات نے ایک پر تکلف ظہرانہ کا انتظام کیا ہوا تھا۔ ظہرانہ سے فراغت کے بعد ہم وہیں سے ایرپورٹ کے لئے روانہ ہوئے کیونکہ ہندوستانی وقت کے مطابق ۵ بجے پی۔ آئی۔ اے سے لاہور کے لئے پرواز کرنی تھی۔ ایرپورٹ کی ضروری کارروائیوں سے ہم پلک جھپکتے فارغ ہو گئے۔ کسٹم حکام نے ہمارے سامان کی ذرہ برابر بھی چیکنگ نہ کی اور نہ ہی کسی قسم کا کوئی سوال وغیرہ پوچھا۔ اللہ کے فضل و کرم سے جہاز ٹھیک پانچ بجے روانہ ہو کر پونے چھ بجے لاہور پہنچ گیا اور ہم "بسم اللہ ولجنا و علیہ ربنا توکلنا" کا ورد کرتے ہوئے جہاز سے باہر آئے۔

اس سفر میں میں نے محسوس کیا کہ امیر محترم نے تعلیم و تعلمِ قرآن کی جس پرزور تحریک کا آغاز کیا تھا اب اس کے اثرات اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے دنیا کے ہر اس حصے تک جہاں بھی اردو سمجھنے

اور بولنے والے لوگ موجود ہیں' نہ صرف پہنچ گئے ہیں بلکہ دور دراز گوشوں میں آڈیو اور ویڈیو کیسٹوں کے ذریعے از خود بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ خود امیر محترم کو حق الیقین کی حد تک وثوق حاصل ہے کہ اگر ہماری شامت اعمال یا تقصیر ہمت اور کوتاہی عمل کے باعث مملکت خداداد پاکستان میں یہ دعوتِ قرآنی انقلاب اسلامی پر منتج نہ ہو سکی تو الفاظ قرآنی

فَاِنْ یَّکْفُرْ بِهَا هٰٓؤُلَآءِ فَقَدْ وَکَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّیْسُوْا بِهَا بِکٰفِرِیْنَ

کے مصداق اللہ تعالیٰ کسی اور خطہ ارضی کو یہ سعادت عطا فرما دے گا کہ وہ قرآن کے اس انقلابی فکر کو حرز جان بنا کر جسے دور حاضر میں ایک موثر دعوت کی صورت دینے کی توفیق اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے موصوف کو عطا فرمائی ہے' بالفعل اسلام کی تشلیثانیہ اور غلبہ دین حق کے دور ثانی کا گہوارہ بن جائے اور وہ صورت عملاً پیدا ہو جائے کہ ؎

آسماں ہو گا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
پھر دلوں کو یاد آ جائے گا پیغام سجود
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی
شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے

★★★

ضرورت رشتہ

دینی مزاج کے حامل نوجوان لیکچرر ایم۔ اے اسلامیات عمر ۳۰ سال رہائشی لاہور کے لیے بیرون ملک رہائش پذیر خوش شکل نیک سیرت لڑکی کا رشتہ مطلوب ہے۔ فوری مکمل تفصیلات لکھیں۔

معرفت ماہنامہ میثاق ۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور

ضمیمۂ میثاق

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

طرمی ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

الحمد للہ کہ اس سال قرآن کالج میں الیف ۔ اے (سال اوّل) کی کلاس میں داخلہ کی صورت حال ہماری توقعات سے بھی زیادہ بہتر رہی۔ حقیقۃً تو یہ ہمارے ربّ کریم کا فضل اور اس کا احسان ہے، لیکن عالم اسباب میں یہ دراصل نتیجہ ہے اراکین انجمن، رفقاء تنظیم اور خط و کتابت کورس کے شرکاء کی مشترکہ محنت اور جدّ و جہد کا۔ چنانچہ ہم اپنے تمام معاونین کے شکر گزار ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کو اپنے اجرِ عظیم سے نوازے۔

داخلہ میں انٹرویو کے لئے ۶۵ طلباء آئے تھے جن میں سے ۶۲ کو داخلہ دیا گیا۔ ابتداءً خیال یہ تھا کہ ان میں سے ۳۰-۳۵ طلباء کو داخلہ کے لئے منتخب کر کے ان پر خوب محنت کی جائے تاکہ ہم بہترین نتائج دے سکیں۔ لیکن چند وجوہ کی بنا پر یہ فیصلہ تبدیل کیا گیا۔ اوّلاً یہ کہ اگر ہم صرف منتخب طلباء ہی کو داخلہ دیتے رہے تو اس طرح بہترین نتائج کی وجہ سے کالج میں داخلہ کے خواہش مند طلباء کی تعداد میں تو یقیناً اضافہ ہو گا اور کالج کی شہرت بھی یقیناً آگے بڑھے گی لیکن ہماری دعوت "رجوع الی القرآن" خاطر خواہ انداز میں آگے نہیں بڑھ سکے گی۔ ثانیاً یہ کہ منتخب طلباء کے ذریعے بہترین نتائج دینا کمال نہیں ہے۔ البتہ ہر سطح کے طالب علم کو داخلہ دے کر بھی اگر بہتر نتائج دئے جائیں تو یہ ضرور کسی درجہ میں کمال ہو گا۔ سو ہم نے اس چیلنج کو قبول کیا ہے۔ ثالثاً یہ کہ جو طالب علم قرآنی علوم کی تحصیل کی نیت سے آرہا ہو، اُسے داخلہ دینے سے انکار کسی ایسی ٹھوس بنیاد پر ہونا چاہیئے کہ ہم آخرت میں اللہ تعالیٰ کے مؤاخذہ سے بچ سکیں۔ اس سلسلہ میں ہمارے ذہن میں سورۂ عبس کی ابتدائی آیات کا شانِ نزول تھا۔ (واضح رہے کہ وسائل کی محدودیت کو اگرچہ ہم ہلکے درجے کی رکاوٹ متصوّر کرتے ہیں تاہم اپنی جگہ یہ Fact/or بھی بہت اہم ہے۔)

_____ اور رابعاً ہمیں یہ احساس تھا کہ داخلہ کا خواہشمند ہر طالب علم ہمارے کسی نہ کسی کرم فرما کی کوشش اور جدّ و جہد کے نتیجے میں آیا ہے۔ یہ وہ وجوہات ہیں جن کی بنا پر فیصلہ کیا گیا کہ الیف ۔ اے (سال اوّل) کے دو سیکشن بنا لئے جائیں اور زیادہ سے زیادہ طلبہ کو داخلہ دیا جائے۔

الحمد للہ کہ ذہنی سطح کے اعتبار سے بھی صورت حال تسلّی بخش ہے۔ داخلہ حاصل کرنے والے طلباء میں سے ۱۷ ایسے ہیں جن کے میٹرک میں ۶۰ فی صد سے ۷۸ فیصد تک نمبر ہیں۔ اور صرف ۱۰ طلباء ایسے ہیں جن کے میٹرک میں ۳۹ فیصد یا اس سے کم نمبر ہیں۔

الف ۔اے کے دو نئے سیکشن بنانے اور زیادہ داخلے دینے کی وجہ سے انجمن کے مالی وسائل مزید دباؤ میں آ گئے ہیں ۔ اس لئے کہ قرآن کالج اور اس کے ہاسٹل بلاک کی تعمیر کی وجہ سے یہ پہلے ہی خاصے دباؤ کا شکار تھے ۔ کالج کے اساتذہ میں اس سال پانچ کُل وقتی اساتذہ کا اضافہ کیا گیا ہے ۔ آپ لوگوں کے علم میں یہ بات ہو گی کہ کالج کے کُل وقتی اساتذہ کو انجمن کی طرف سے مروّجہ گریڈ ۱۷ دیا جاتا ہے ۔ اس کے علاوہ چند جز وقتی اساتذہ کا تقرر بھی عمل میں لایا گیا ہے ۔

الف ۔اے ، بی ۔ اے اور ایک سالہ کورس میں داخلوں کے بعد اب کالج میں طلباء کی کُل تعداد ۱۱۸ ہو گئی ہے ۔ الحمدللہ کہ ان میں سے ۷۶ طلباء خود کفیل ہیں ، جبکہ ۴۲ طلباء کے تعلیمی اخراجات کی ذمہ داری انجمن پر ہے اور ایک طالب علم پر انجمن اوسطاً ۴۰۰ روپے ماہوار خرچ کر رہی ہے ۔

اس صورتحال کے پیشِ نظر ضرورت محسوس ہو رہی ہے کہ انجمن کے مالی وسائل کو تقویت بہم پہنچائی جائے ۔ اس کی سب سے بہتر ، پائیدار اور مستقل صورت یہی ہے کہ انجمن کے ارکین کی تعداد میں اضافہ کیا جائے ۔ چنانچہ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ اس سال کے اختتام یعنی ۳۱ دسمبر ۸۹ء تک انجمن کے کم ازکم ۵۰۰ نئے اراکین بنائے جائیں ۔ یہ ایک مشکل ہدف ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں ہے اگر اراکین انجمن میں سے ہر رکن اپنے حلقہ میں سے کم ازکم ایک نیا رکن بنائے ، نیز رفقاءِ تنظیم اور شرکاءِ خط وکتابت کورس میں سے ہر فرد پہلے خود رکن بنے (اگر اب تک نہیں بنا ہے) اور اپنے حلقہ سے کم ازکم ایک نیا رکن بنائے تو ۵۰۰ سے کہیں زیادہ اراکین بن سکتے ہیں ۔ بات صرف جدّوجہد کی ہے اور اگر ہم سب مل کر جہاد کریں تو بڑے سے بڑا ہدف بھی سرنگوں ہو جائے گا ۔ ان شاء اللہ تعالیٰ ۔ اَلسَّعیُ مِنّا وَ الْاِتمامُ مِنَ اللہ ۔

اس جہاد فی سبیل اللہ میں شرکت کے خواہش مند حضرات کی راہنمائی اور سہولت کی غرض سے انجمن کے قواعد وضوابط کے چیدہ چیدہ نکات درج ذیل کئے جا رہے ہیں ۔ تفصیلاً مطالعہ کے خواہش مند حضرات خط لکھ کر قواعد وضوابط کا کتابچہ طلب کر سکتے ہیں ۔ رکنیت کا فارم بھی منسلک ہے ۔ مزید فارم خط لکھ کر بھی طلب کر سکتے ہیں اور اس کی فوٹو کاپی بھی استعمال کی جا سکتی ہے ۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کا حامی و ناصر ہو اور ہمارے اس حقیر سے جہاد کو شرفِ قبولیت بخش کر ہم سب کے لئے ذخیرۂ آخرت بنا دے ۔ آمین ! دعاگو و دعاجو

لطف الرحمٰن خان ، ناظم نشر واشاعت

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے قواعد وضوابط کے چند اہم نکات

۱۔ انجمن کے مقاصد میں بنیادی مقصد لوگوں کو قرآن حکیم کی جانب متوجہ کرنا ہے۔ اسی سبب سے انجمن کے کام کو دعوت رجوع الی القرآن کا نام دیا گیا ہے۔

۲۔ اراکین انجمن کے تین حلقے ہیں۔ (i) حلقۂ محسنین۔ یعنی وہ لوگ جو رکنیت اختیار کرتے وقت یکمشت پانچ ہزار روپے ادا کرتے ہیں اور جن کا ماہانہ زرِتعاون کم ازکم ایک سو روپے ہوتا ہے۔ (ii) حلقہ مستقل ارکان۔ یعنی وہ لوگ جو رکنیت اختیار کرتے وقت یکمشت دو ہزار روپے ادا کرتے ہیں اور جن کا ماہانہ زرِتعاون کم ازکم پچاس روپے ہوتا ہے۔ (iii) حلقہ عام ارکان۔ یعنی وہ لوگ جو یکمشت کچھ ادا نہیں کرتے اور جن کا کم ازکم ماہانہ زرِتعاون پچیس روپے ہوتا ہے۔

۳۔ انجمن کی مجلسِ منتظمہ چودہ ارکان پر مشتمل ہوتی ہے جس میں سے بارہ منتخب ہوتے ہیں اور دو نامزد۔

۴۔ مجلسِ منتظمہ کے منتخب ارکان میں سے چھ کو حلقۂ محسنین، دو کو حلقہ مستقل ارکان اور چار کو عام ارکان منتخب کرتے ہیں۔

۵۔ مجلسِ منتظمہ کے انتخاب کے لئے صرف ایسے وابستگان انجمن کے نام تجویز کئے جاسکتے ہیں جو (i) چالیس سال سے کم عمر کے نہ ہوں۔ (ii) انجمن سے وابستگی کا تین سال کا عرصہ مکمل کر چکے ہوں (iii) نہ تو انجمن کے زیرِکفالت ہوں اور نہ ہی انجمن میں کسی منفعت بخش عہدے پر فائز ہوں۔

۶۔ لاہور میں رہائش پذیر صرف وہ مرد وابستگانِ انجمن اپنا حق رائے دہی استعمال کر سکتے ہیں جو سالانہ اجلاسِ عام میں موجود ہوں۔

۷۔ لاہور میں رہائش پذیر خواتین اور بیرونِ لاہور رہائش پذیر خواتین وحضرات بذریعہ ڈاک اپنا حق رائے دہی استعمال کر سکتے ہیں۔

۸۔ انتخاب میں صرف وہ وابستگان انجمن حق رائے دہی استعمال کر سکیں گے جن کی انجمن سے وابستگی کو ایک سال کا عرصہ گزر چکا ہو۔

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور۔ ۵۴۷۰۰۔ فون: ۸۵۶۰۰۳-۸۵۶۰۰۴

درخواست رکنیت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محترم اراکین مجلس منتظمہ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

میں مسمّی / مسماۃ (مکمل نام مع ولدیت) .....

(پتہ) .....

فون نمبر .....

اپنے آپ کو مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے حلقہ محسنین / مستقل ارکان / عام ارکان میں شمولیت کے لیے پیش کرتا ہوں / کرتی ہوں۔

یکمشت زر تعاون _____ روپے بشکل نقد / چیک / ڈرافٹ نمبر _____

بنام _____ بنک لمیٹڈ _____ پیش خدمت ہے۔

مجھے انجمن کی قرارداد تاسیس و اغراض و مقاصد سے مکمّل اتفاق ہے اور میں نے انجمن کے قواعد و ضوابط کا بھی مطالعہ کر لیا ہے۔

چنانچہ میں مبلغ ★ _____ روپے ماہانہ زر تعاون ادا کرتا رہوں گا / رہوں گی۔

مزید برآں انجمن کے اغراض و مقاصد کے لیے حتی المقدور عملی تعاون بھی پیش کرتا رہوں گا / کرتی رہوں گی۔ اللہ تعالیٰ میرے اس انفاق کو قبول فرمائے اور مجھے اپنے دینِ متین کی بالعموم اور اپنی کتابِ عزیز کی بالخصوص خدمت کی بیش از بیش توفیق عطا فرمائے۔ (آمین) والسلام

تاریخ _____ دستخط _____

★ مؤسسین و محسنینِ انجمن کے لیے کم از کم ماہانہ زر تعاون ایک سو روپے ماہوار، مستقل ارکان کے لیے پچاس روپے ماہوار اور عام ارکان کے لیے پچیس روپے ماہوار ہے لیکن حسب استطاعت جتنا زیادہ دینا چاہیں وہ تحریر فرما دیں۔

Jawad®
Products

We are manufacturing and exporting ready made garments (of all kinds including shirts, trousers, blouses, jackets, uniforms, hospital clothing; kitchen aprons), bedlinen, cotton bags, textile piece goods etc.

For further details write to :

M/s. Associated Industries (Garments) Pakistan (Private) Ltd.,
IV/C/3-A (Commercial Area),
Nazimabad,
Karachi - 18
Tele : 610220/616018/625594

MONTHLY
Meesaq
LAHORE

Regd.L.No 7360
VOL.38 No.12
DECEMBER 1989